ہسپانیہ سے امریکا تک

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

سقوطِ اندلس سے دریافتِ امریکا تک پھیلی ہوئی
عیسائی انتہا پسندی اور مسلم کوتاہ عملی کی لرزہ خیز داستان

•

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

•

Cell: 0321-2050003, 0313-9266138
E-mail: assaeed313@yahoo.com

نام کتاب .... ہسپانیہ سے امریکہ تک
مصنف .... مفتی ابولبابہ شاہ منصور
طبع اوّل .... ۱۴۳۱ھ بمطابق 2010ء
ناشر .... السعید، کراچی

ملنے کے پتے

ادارۃ الانور، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ فون: 021-34914596
مکتبہ انعامیہ، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0343-2288277
دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32631861
مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور۔ موبائل: 0300-4501769
ادارہ تحقیقات اسلامی، اردو بازار، لاہور۔ موبائل: 0333-4380927
لاثانی اسٹیشنرز، ایبٹ آباد۔ موبائل: 0334-8997011
کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی۔ فون: 051-5771798
ادارۃ النور، ملتان۔ موبائل: 0300-7332359
مکتبہ فاروقیہ، مینگورہ، سوات۔ موبائل: 0946-729070
اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد۔ موبائل: 0321-7693142
مکتبہ علمیہ، پشاور۔ فون: 091-2580319
مسلم بک لینڈ، مظفر آباد۔ فون: 05822-444238

فہرست

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

عنوان	صفحہ

دوسرا باب: دوزخِ دہن کشیدہ

عنوان	صفحہ

انتساب

درخشاں اسلامی روایات کی امین
''جامعِ قرطبہ'' کے اس اکلوتے مینار* کے نام
جس پر چھائی حسرت وافسردگی
پانچ صدیوں سے غازیانِ اسلام
کی راہ تک رہی ہے۔

* مینار کی بولتی تصویر: صفحہ 251

مقدمہ

جنتِ گم گشتہ کی تلاش

ہسپانیہ ہمارے لیے جنتِ گم گشتہ ہے تو امریکا دوزخ دہن کشیدہ۔ ہسپانیہ کو کھو کر ہم جنت ارضی سے محروم ہوئے اور امریکا سے دوستی لگا کر ہم نے خود پر جہنم کے دروا کر لیے ہیں۔ ہسپانیہ کے سقوط اور امریکا کی دریافت میں جو مماثلت اور مناسبت ہے ہمارے محققین اور تاریخ نویسوں نے ہمیں اس سے آگاہ نہیں کیا۔ اس لیے ہم امریکا سے خیر خواہی کی امید رکھتے ہیں تو بد خواہی کا آتش فشاں پھوٹ پڑتا ہے۔ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو منافقت آمیز دشمنی کے کریہہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ابھی اس کی بد نیتی، بدعہدی اور بدسلوکی پر ہمارا تعجب اور حسرت کسی حد کو نہیں پہنچ پاتی کہ بد معاملگی، بدگوئی اور نفرت آمیز دشمن داری کا نیا مرقع رقم ہونے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ امریکا کی نفسیات اور فطرت میں ہماری تحقیر، استہزا اور عداوت کیونکر رچ بس گئی ہے؟ اس کے مزاج اور رویے میں کیوں ہم سے دائمی اوازاری پائی جاتی ہے؟ اس سب کچھ کا جواب جس نکتے میں پوشیدہ ہے یہ کتاب اس کی نقاب کشائی کرتی ہے۔

مسلم امہ اور دنیا کی تمام مظلوم اقوام امریکا کے جابرانہ اور سنگدلانہ رویے سے نالاں اور شکوہ کناں ہیں ...... لیکن ہمارے محققین، تاریخ دان اور ادیب اس بات کی

وضاحت سے غافل یا قاصر رہے ہیں کہ اس امریکی سائیکی کے پس پردہ عوامل واسباب کیا ہیں؟ اور کیا وہ عوامل واسباب اس نوعیت کے ہیں کہ جوابی حسن سلوک یا درگزر وچشم پوشی سے ان کا ازالہ یا امالہ ہوسکتا ہے۔ اس کا واضح، دوٹوک اور حتمی جواب یہ ہے کہ یہ اسباب دائمی ہیں اور ان کا ازالہ نہیں ہوسکتا...... لیکن ہمارے اہل قلم کی یہ بہت بڑی کوتاہی تھی کہ وہ اس کی بات کو صاف لفظوں میں کھول کر تو کجا، بین السطور میں گھول کر بھی بیان نہیں کر سکے جس کا خمیازہ مسلم امہ بھگت رہی ہے۔ یہ کتاب جن مضامین کا مجموعہ ہے ان میں اپنی بساط کے مطابق کسی حد تک اس کوتاہی کی تلافی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کو پڑھا نہ جائے، صرف سونگھ لیا جائے تو سمجھ آ سکتا ہے کہ امریکا کی دوستی، دوستی نہیں، خودکشی ہے۔ اس کی امداد ایسا جان لیوا زہر ہے جس کا تریاق نہیں۔ اس کے قرضے ایسا جال ہیں جن سے نکلنے کے لیے جتنا پھڑ کا جائے گا اس جال کے تار اتنا ہی بدن میں گھستے جائیں گے۔ امریکا پر خود مشہور یہودی رہنما اور امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے جو تبصرہ کیا تھا اس سے اچھا تبصرہ ممکن نہیں۔ اس نے کہا تھا: ''امریکا کی دشمنی کا توڑ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی دوستی کا علاج کسی کے لیے ممکن نہیں۔'' دوسرے لفظوں میں امریکا کی دشمنی مول لے کر جیا جا سکتا ہے لیکن اس کی دوستی کا شکار ہو جانے کے بعد باعزت زندگی کا کوئی امکان نہیں۔ کاش ہماری قوم کو یہ بات سمجھ میں آ جائے۔ یہ محنت اس وقت ٹھکانے لگ سکے گی۔

امریکا کو عالمی قیادت کا ہوکا ہے لیکن اس کے لیے جس اخلاقی بلندی، وسعت نظری اور انسانی رویوں سے آراستگی کی ضرورت ہے، نہ صرف یہ کہ امریکا اس کے عشر عشیر کو نہیں پہنچتا بلکہ اس حوالے سے اس قدر پستی کا شکار اور ایسے بدترین ریکارڈ کا حامل ہے کہ اسے عالمی قیادت کے منصب پر فائز کرنا تو کجا، عالمی برادری کی پچھلی صفوں میں شامل کرنا محل نظر ہے۔ اس کی وجہ پوچھی جائے تو وہ سیدھی سیدھی گنتی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ چنگیز خان کی

گردن پر 34 ملین اور ہلاکو خان 5 صرف 4 ملین افراد کا خون بتایا جاتا ہے۔ تیمور لنگ کی خون آشام تلوار 14 ملین کا خون پی گئی جبکہ جرمن نازی رہنما ایڈولف ہٹلر کو 21 ملین کا جان لیوا بتایا جاتا ہے۔ یہ کل 73 ملین افراد ہوئے جبکہ امریکا کے ذمہ اب تک (2007ء مراد ہے)173 ملین افراد کا قتل بلا شک وشبے ثابت ہے۔ حساب جوڑ لیں:

ریڈ انڈینز	100 ملین
افریقن	60 ملین
ویت نامی	10 ملین
افغان	2 ملین
عراقی	1 ملین
کل فرد جرم	173 ملین

اب آپ ہی بتائیے کہ اگر 73 ملین مظلومین کے قاتلوں کو ''انسانیت کا قاتل'' کہا جاتا ہے تو 173 ملین کی رگ جان سے خون پینے والے امریکا کو کیا نام دینا چاہیے جبکہ تا حال اس کی خون آشامی کا سلسلہ جاری وساری ہے!!؟؟

ایک اور نکتے کی طرف آیئے: امریکا کے اعلان آزادی (1776) سے 2005ء تک امریکی مسلح افواج 220 مرتبہ اقوام عالم کے خلاف جارحیت کی مرتکب ہو چکی ہیں۔ ان دوسوتیس سالوں میں دوسوبیس مرتبہ جارحیت کے ارتکاب کی یہ شرح کسی بھی ملک کی شرح جارحیت سے کئی گناہ زیادہ اور بیشتر صورتوں میں کئی سو گناہ زیادہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکا تئیس ملکوں پر بمباری کا مرتکب ہو چکا ہے۔ ان ممالک میں چین (دو مرتبہ) گوئٹے مالا (تین مرتبہ) کوریا، انڈونیشیا، کیوبا، کانگو، پیرو، سوڈان، افغانستان لاؤس، ویت نام، کمبوڈیا، گرینیڈا، لبنان، لیبیا، السالویڈور، نکاراگوا، پانامہ، عراق، (دو مرتبہ) اور یوگوسلاویہ شامل ہیں۔

ایک طرف تو امریکا عالمی رہنما، قائد، متسلط اور اس کرۂ ارض کے خزانوں کا مالک

ہونے کے لیے بے چین ہے تو دوسری طرف ہمارے حکمران اس کی کاسہ لیسی اور جی حضوری میں اپنی قوم کی نجات وترقی مضمر سمجھتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے اسپین کے سقوط کا ذمہ دار بدنصیب اور بدعمل، عیسائیوں کا کاسہ لیس حکمران ابوعبداللہ اپنی قوم سے کہتا تھا کہ یہ سب کچھ (عیسائیوں سے تعلقات، ان سے معاونت طلبی اور آخر میں رحم طلبی) میں تمہارے فائدے اور تمہاری نجات کے لیے کر رہا ہوں جبکہ در پردہ خط و کتابت میں وہ ذاتی مراعات زیادہ سے زیادہ طلب کرنے کے لیے مذاکرات کو طول دیتا رہتا تھا۔ ہم بھی آج ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن کبھی ''گاجر'' کی لالچ میں ذاتی مراعات کی فہرست پر بحث کرتے ہیں اور کبھی ''چھڑی'' کے خوف سے کام دُشمن کا کرتے اور نام وطن کا لیتے ہیں۔ اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیں تاریخ کے آئینوں میں اس طرح کے مناظر دکھاتی اور اس جیسے انجام سے ڈراتی ہے جس کا سامنا خود کو ناگزیر سمجھنے اور حب الوطنی کا راگ الاپ کر مفادات بٹورنے والے حکمرانوں اور ان کی سہل پسند اور آرام طلب عوام کو کرنا پڑا تھا۔

زیرنظر کتاب میں تاریخ کے گمشدہ اوراق میں پوشیدہ مخفی حقائق، اعداد وشمار، تجزیے وتبصرے اور کچھ پیش گوئیاں ہیں۔ کوئی بھی مصنف اپنی کتاب کے مقدمے میں کسی دوسری کتاب کا تعارف نہیں کرواتا...... لیکن ہماری آخری غرض اور ہمارا اولین ہدف تو اللہ کی رضا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی بھلائی ہے اس لیے اس روایت کو توڑتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ بندہ جب اس موضوع کی کھوج میں نکلا تھا اس وقت سے آج تک اس موضوع پر بندہ کو...... اپنی جستجو اور علم کی حد تک ...... ایک ہی کتاب ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ پہلی کتاب اس قدر معلومات افزا اور قابل قدر تحقیقی دستاویزات سے آراستہ ہے کہ آخری کتاب بلکہ اس موضوع پر حرف آخر لگتی ہے۔ کتاب کا نام تو ہے ہی عجیب ''ہوئے تم دوست جس کے'' لیکن اس میں ادب

اور تحقیق کے امتزاج سے جو شاندار کام کیا گیا ہے وہ اس قدر لائق تحسین اور قابل داد ہے کہ مصنف کو بلاشبہ کسی اعلیٰ ایوارڈ کا حقدار بناتا ہے۔ میرے اس تبصرے میں اگر کسی صاحب کو مبالغہ محسوس ہو تو وہ اس کتاب میں دی گئی دستاویزات کا عکس اور تصاویر ہی دیکھ لے۔ اسے اندازہ ہو جائے گا کہ یہ تبصرہ مبالغہ آمیز نہیں بلکہ کفایت شعاری پر مبنی ہے۔ بندہ کے مضامین ضرب مومن میں متذکرہ بالا کتاب کی اشاعت سے کم از کم تین سال قبل شائع ہو چکے تھے لیکن کتابی صورت میں اس کتاب کی اشاعت کے ایک سال بعد اکٹھے ہو سکے اس لیے نقش اوّل وہی کتاب یعنی ''ہوئے تم دوست جس کے'' ہے۔ مصنف ہیں ڈاکٹر حق حقی اور ملنے کا پتہ ہے: شفیق بک سینٹر چوک گڑھی شاہو لاہور۔ فون 92-42-6304761۔ بندہ کی کتاب اگر پہلے چھپتی تو عکس اول ہوتی لیکن اب وہ اس موضوع پر نقش ثانی ہے۔ بہر حال بندہ نے جو حوالے اور اقتباسات حقی صاحب کی کتاب سے لیے ہیں اُس کے لیے ان سے باقاعدہ اجازت لی گئی تھی۔ بندہ اس پر ان کا تہہ دل سے ممنون ہے۔

کتابوں کے ابواب اور عنوانات میں تسلسل ہوتا ہے لیکن زیر نظر کتاب چونکہ تقریباً پانچ سال کے عرصے میں لکھے گئے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اس لیے اس میں نہ ابواب ہیں اور نہ مربوط تسلسل .... البتہ عنوانات میں خاص قسم کا ربط ضرور ہے جو پڑھنے کے بعد ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس تحریر میں امریکی دوزخ سے چھٹکارے کا جذبہ اتنی شدت سے کارفرما نہیں جتنا کہ ہسپانوی جنت گم گشتہ کے حصول کا محرک اثر انداز ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے نام پر، اللہ کے لیے اور اللہ کے مظلوم بندوں کی آگاہی کے لیے ہے۔ اللہ کرے ہم اس جہنم کو سرد کر کے اُس جنت تک پہنچ سکیں جو بن زیاد کے وارثوں کے قدم چومنے کے لیے ترس رہی ہے۔

شاہ منصور

عشرۂ اول: رمضان ۲۸ ھ

پہلا باب

داستان سرفروشوں کی

بہادری کا صلہ:

یہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کی ابتدا کی بات ہے۔ شاہان خوارزم کی قوت عروج پر تھی۔ وہ ایران وخراسان اور شام وعراق پر قابض تھے اور ایشیا کی تمام اسلامی سلطنتوں کو فتح کر لینا چاہتے تھے کہ عین اس وقت جب وہ اپنے اس ارادے کی تکمیل کے قریب تھے، تاتاریوں کا فتنہ برپا ہو گیا۔ چنگیز خان اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ اٹھا اور سلطنت خوارزم کو ختم کر ڈالا۔ یہاں کے قبائل اگرچہ بہت بہادر اور جہانبانی کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے مگر تاتاریوں کے ریلے کا سامنا نہ کر سکے اور انہیں اپنی جان بچا کر منتشر ہو جانا پڑا۔ یہ قبائل نسلاً ترک تھے۔ انہی میں سے ایک ترک سردار ''ارطغرل'' کا قبیلہ بھی تھا جو اپنا وطن چھوڑ کر سلطان علاؤالدین سلجوقی کے پاس پناہ لینے اس کے پایۂ تخت قونیہ (موجودہ ترکی) کی طرف جا رہا تھا۔ یہ جماعت جو صرف چار سو کے لگ بھگ گھرانوں پر مشتمل تھی، جب راستہ میں انگورا نامی مقام پر پہنچی تو اسے ایک حیرت انگیز نظارہ دیکھنے کو ملا۔ سامنے دو فوجیں مصروف جنگ تھیں۔ ان میں سے ایک کمزور پڑ رہی تھی اور دوسری

مضبوط ہونے کی وجہ سے بڑھ چڑھ کر حملے کر رہی تھی۔ سردار طغرل سے نہ رہا گیا اس نے کمزور فریق کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور اپنے سواروں کے مختصر دستے کے ساتھ میدان میں اتر آیا۔ یہ دستہ صرف چار سو چوالیس افراد پر مشتمل تھا لیکن یہ سب منجھے ہوئے شہسوار تھے۔ گردش زمانہ کے سبب آج یہ اپنے وطن سے دور پناہ کی تلاش میں تھے لیکن ان کی رگوں میں فاتحین کا خون دوڑ رہا تھا۔ یہ اس جانبازی سے فریق مخالف پر حملہ آور ہوئے کہ اسے تھوڑی دیر میں ہی میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ میدان مار لینے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ جس فریق کو انہوں نے بروقت اور غیر متوقع طور پر امداد کی وہ سلطان علاؤ الدین سلجوقی کی فوج تھی جسے تاتاریوں کی ایک بڑی فوج نے گھیر رکھا تھا۔ سردار ارطغرل اور اس کی جماعت نے اپنی نیک نیتی اور بہادری کے سبب انجانے میں جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کے صلے میں سلطان نے اسے انگورا نامی شہر کے قریب وسیع جاگیر عطا کی۔ یہ زرخیز علاقہ موجودہ استنبول شہر کے قریب تھا اور اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ قیصر روم کے علاقے کی سرحد (ایشیا اور یورپ کے سنگم) پر واقع تھا۔

شریف النفس سردار:

سلطان علاؤ الدین سلجوقی نے سردار ارطغرل کو یہ علاقہ دے کر جہاں اس کے کارنامے کا اعتراف کیا تھا وہیں اس غریب الوطن ترک سردار کی ایک نئی آزمائش شروع ہوگئی تھی۔ اس کا علاقہ یورپ کی بازنطینی سلطنت (سلطنت روما) کی سرحد پر تھا جہاں یورپی قلعہ داروں سے اکثر جنگ کی نوبت آتی رہتی تھی۔ بوڑھے ترک سردار کو عیسائیوں سے شوق جہاد کی تکمیل کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی فطری شجاعت اور بہادری کا ایسا سکہ جمایا کہ عیسائی اپنے علاقے میں سمٹے رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کی پے در پے فتوحات کی ایسی دھاک بیٹھ گئی کہ بہت سے دیگر ترک قبائل آ کر اس کے پرچم تلے

جمع ہونے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی قیادت میں مسلمانوں نے تاتاریوں اور یورپی عیسائیوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ یہ ایک یادگار واقعہ تھا جس پر خوش ہو کر سلطان علاؤ الدین نے اسے مزید جاگیر عطا کی اور اسے اپنے مقدمۃ الجیش (لشکر کے اگلے حملہ آور حصے) کا سپہ سالار مقرر کیا۔ سلطان علاؤ الدین کے علم پر ہلال کا نشان ہوتا تھا۔ سردار ارطغرل نے اس کے نائب کی حیثیت سے اس نشان کو اختیار کیا جو آج تک ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے۔ 987ھ/1288ء میں یہ بوڑھا سردار 90 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ اس کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا غازی عثمان خان تیس سال کی عمر میں اس کا جانشین ہوا۔ یہ سلطنت عثمانیہ کا بانی اور سلاطینِ آلِ عثمان کا پہلا تاجدار ہے۔ یہ شخص عجیب وغریب خوبیوں کا مالک اور سادگی، جفاکشی، خداترسی اور دیانتداری میں قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کا مکمل نمونہ تھا۔ سلطان علاؤ الدین نے اسلامی سلطنت کے لیے اس کی خدمات سے خوش ہو کر اسے اعلیٰ خطابات سے نوازا اور اپنا سکہ جاری کرنے اور جمعہ کے خطبے میں اپنا نام شامل کرنے کی اجازت بھی دی۔ غازی عثمان خان کے علاوہ سلطان کے ماتحت دیگر امرا اس سے باغی ہو کر چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم کر لیتے تھے مگر یہ اتنا شریف النفس اور وفاشعار تھا کہ ان امراء سے کہیں زیادہ طاقتور اور صاحبِ حیثیت ہونے کے باوجود اپنے باپ کی طرح آخر دم تک سلطان کا وفادار رہا اور اپنی فتوحات سے سلطان کی شان وشوکت میں اضافہ کرتا رہا۔

وفاداری کا انعام:

خداتعالیٰ کو اس کی وفاداری کا صلہ دینا اور اس سے کام لینا مقصود تھا چنانچہ اس کی بغاوت اور بے وفائی کے بغیر خود بخود سلجوقی حکومت اس کی جھولی میں آ گری۔ ہوا یوں کہ تاتاریوں نے سلطان علاؤ الدین سلجوقی کے خلاف ایک بڑا حملہ کیا (699ھ/1300ء) جس میں سلطان شہید ہو گئے۔ تاتاریوں نے اس کے لڑکے غیاث الدین کو بھی قتل کر دیا۔

اس پر سلطنت سلجوقیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ تمام سلجوقی ترکوں نے بالاتفاق سلطنت قونیہ کے تخت پر غازی عثمان خان کو بٹھایا اور اس کی اطاعت کا عہد کیا۔ اس طرح وہ سلطنت وجود میں آئی جس نے عرصہ دراز تک ایشیا سے یورپ تک دبدبے کے ساتھ حکومت کی۔ جس کے سپوتوں نے قسطنطنیہ فتح کر کے تاریخ کا رخ بدل ڈالا اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بشارت کے مستحق بنے۔ جس کو اگر اپنوں کی جفا کاری عین وقت پر پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتی تو عین ممکن تھا کہ وہ سارے یورپ سے عیسائیت کا خاتمہ کر کے اسے اسلام کے زیر نگین لے آتے۔ جس کو خلافت عباسیہ کے بعد مرکز اسلام کی حیثیت حاصل ہوئی اور اس کے فرمانرواؤں نے ایسے کارنامے انجام دیے جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے باعث فخر رہیں گے۔

سلطان غازی عثمان خان کی نسل میں اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے فاتحین پیدا کیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان خود نہایت رحمدل، سخی اور خدا ترس شخص تھا۔ پھر اس کی شادی بھی ایسی خاتون سے ہوئی جو ایک خدا رسیدہ بزرگ عالم کی صاحبزادی تھی اور تقویٰ و پارسائی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھی۔ پہلے ہم سلطان کے ذاتی اوصاف کا ذکر کرتے ہیں پھر اس کی شادی کا واقعہ، تاکہ علم ہو سکے کہ اس عظیم سلطنت کے بانی کے کن اوصاف کی بنا پر خدا تعالیٰ نے اس کی اولاد سے اتنا کام لیا۔

ذاتی اوصاف:

سلطان عثمان خان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے جو ایک بانیٔ سلطنت کے لیے ضروری ہیں۔ اس کی ہمت اور شجاعت غیر معمولی تھی۔ اسے قیادت کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ میدان جنگ میں اس کی بہادری سپاہیوں میں دلیری کی روح پھونک دیتی تھی اور انتظام حکومت میں اس کی دانشمندی رعایا کے دلوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ اس کے عدل

وانصاف کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، اس کی عدالت میں ترک وتاتار، مسلم وعیسائی سب برابر تھے۔ رعایا کی بہبودی اس کا نصب العین اور ملک کی خوشحالی اس کا مطمحِ نظر تھے۔ قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی طرح اس کا طرزِ زندگی نہایت سادہ اور نمائش سے یکسر پاک تھا۔ دولت اس نے کبھی جمع نہیں کی، تمام مالِ غنیمت غریبوں اور یتیموں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اس کے رہنے کا جو مکان تھا اس میں سونے چاندی یا جواہرات کی قسم سے کوئی چیز بھی اس کے مرنے کے بعد نہیں ملی، صرف ایک سوتی عمامہ، لکڑی کا ایک چمچہ، ایک نمکدان، چند خالص عربی گھوڑے، زراعت کے لیے بیلوں کے چند جوڑے اور بھیڑوں کے کچھ گلّے۔ علم اور اسلحہ کے علاوہ بس یہی اس کی ساری کائنات تھی۔ وہ نہایت فیاض، نہایت رحم دل اور نہایت مہمان نواز تھا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے اس کی ہر دلعزیزی عام تھی، چنانچہ سلاطین آل عثمان کی تخت نشینی کے موقع پر جب اس کی تلوار جو ابھی تک محفوظ ہے، اس کے جانشینوں کی کمر سے باندھی جاتی تھی تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کی جاتی تھی: ''خدا اس میں بھی عثمان جیسی خوبیاں پیدا کر دے''۔

اشارۂ غیبی:

سلطان کی شادی کا قصہ کچھ یوں ہے کہ اس کے شہر سے قریب ابترونی نام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک خدارسیدہ عالم رہا کرتے تھے۔ عثمان اپنی نوعمری کے زمانہ میں ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ان کی ایک لڑکی تھی جو شرافت اور نیکی میں اپنی مثال آپ تھی۔ ایک روز غازی عثمان نے اس کیلیے نکاح کا پیغام دیا، لیکن یہ عالم چونکہ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لیے فرقِ مراتب کا لحاظ کر کے انہوں نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا۔ اس درمیان میں چند اور ترک سرداروں نے بھی جو طاقت اور وجاہت میں عثمان سے بڑھے ہوئے تھے، ان خاتون سے شادی کی خواہش کی، لیکن ان عالم نے ان کو

بھی صاف جواب دیا۔ ایک رات غازی عثمان نے یہ عجیب وغریب خواب دیکھا کہ ایک چاند ہلال بن کران عالم کے سینہ سے نکلا اور رفتہ رفتہ بدر کامل بن کراس کے سینہ میں اتر آیا، پھراس کے پہلو سے ایک زبردست درخت نمودار ہوا جو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحروبر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینوب بہہ رہے تھے اور چار بڑے بڑے پہاڑ کوہ قاف، کوہ بلقان، کوہ طور اور کوہ اٹلس اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ دفعۃً ایک نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رخ جو شکل میں تلوار سے مشابہ تھیں ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہو گیا۔ یہ شہر جو دو سمندروں اور براعظموں کے اتصال پر واقع تھا، ایک انگوٹھی کے مانند دکھائی دیتا تھا جس میں دو نیلم اور دو زمرد جڑے ہوئے تھے۔ سلطان اس انگوٹھی کو پہننا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے یہ خواب ان عالم سے بیان کیا، انہوں نے اسے ایک اشارۂ غیبی سمجھ کر اپنی صاحبزادی کو ان کے نکاح میں دے دیا۔ اس طرح اس خاندان کی بنیاد پڑی جس کی قائم کردہ سلطنت ایشیا، یورپ اور افریقہ تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور جس کے شہسواروں کی ٹاپوں کی گونج سے یورپ کی راجدھانیاں کانپا کرتی تھیں۔

دو تاریخی موقعے

''مولانا صاحب! ایک بات کا جواب تو دیجیے۔''

''ضرور ضرور! ہم فرصت سے بیٹھے ہیں اور آپ کوئی اچھا موضوع چھیڑیں تو ممکن ہے کچھ اچھی اور کارآمد گفت وشنید ہو جائے۔''

''ایک سوال نے مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ میرا ایک دوست تو مسلسل اس کے جواب کے لیے کوشاں رہتا ہے۔''

''آپ ارشاد فرمائیے، بندہ ہمہ تن گوش ہے۔''

''قرآن شریف میں آتا ہے: ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب فرمائے اور اس امر پر گواہی کے لیے اللہ رب العزت کافی ہے۔'' (الفتح: 28) اس آیت مبارکہ میں بھی اسلام کے ''غلبۂ کلّی'' کی جو بشارت دی گئی ہے، یہ کب پوری ہوگی؟ کیا تاریخ میں ایسا کوئی وقت آیا ہے جب اسلام کو بعینہٖ تمام مذاہب پر، پورے کرۂ ارض کے ادیان پر ''غلبۂ کلّی'' حاصل ہوا ہو؟''

''آپ نے بڑا اہم اور دلچسپ سوال کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں ہم جیسے راہ چلتوں کا لب کشائی کرنا زیبا نہیں دیتا، چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔.........مگر اب تک جو کچھ تلاش وجستجو کے بعد سمجھ میں آیا وہ اہلِ علم کی خدمت میں تصحیح کے لیے پیش کرنا چاہتا ہوں اور ان کی طرف سے رہنمائی کا منتظر ہوں۔''

''آپ کو اس حوالے سے اب تک کیا کچھ کامیابی حاصل ہوئی؟''

''بندہ ایک عرصہ تک اس بارے میں سرگرداں رہا۔ اس حوالے سے ایک تاریخی معرکہ کے مقام کی درست تعین اور ایک دوسرے کرشماتی واقعہ کے محل وقوع کے لیے تقریباً تین سال سے تلاش میں ہوں، ابھی بھی مکمل تحریری یا عکسی مواد تک رسائی نہیں ہو سکی۔ بہرحال اس امر کی تحقیق میں بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ غلبۂ دین سے علمی اور فکری غلبہ مراد ہے اور امرِ واقع یہ ہے کہ علمی اور نظریاتی اعتبار سے دینِ اسلام اس وقت کائنات کا وہ واحد دین ہے جو نقل وعقل، معروضی استدلال، منطقی حقائق اور فطری تقاضوں کی تکمیل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ یہ وہ واحد مذہب ہے جس کی بنیادی تعلیمات، جس کی آسمانی کتاب، جس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اصل حالت میں محفوظ ہے، جس میں اتنا زیادہ اور وقیع تحقیقی، علمی ونظریاتی لٹریچر پایا جاتا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں ملتی، جس کے ماننے والوں نے اس کی اتنی ہمہ جہت اور متنوع علمی ونظریاتی خدمت کی ہے کہ اس کے ایک ایک جزئی مسئلہ پر کئی نئی کتابیں اور مقالے ملتے ہیں اور جس کے بعض موضوعات پر تو پوری پوری لائبریریاں مل جائیں گی۔ اگر اس حوالے سے دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب پر نظر ڈالی جائے تو علمی وتحقیقی اعتبار سے ہم ان کو بہت پیچھے پاتے ہیں۔ ان کا کل سرمایہ چند مذہبی داستانوں سے زیادہ کی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کے مذہبی علماء کی جمع پونجی چند گول مول اور ہر تاویل پر منطبق ہو جانے والی باتوں، غیر مستند قصوں اور گھڑی

گھڑائی رسوم کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور ان کا مذہبی لٹریچر انسان کی ترقی یافتہ فکر و نظر کی بلند پروازیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ غیر آسمانی اور چھوٹے چھوٹے علاقائی مذاہب کو تو چھوڑیے، آسمانی مذاہب جن کو انسانوں کی اکثریت مانتی ہے اگر ایک تعلیم یافتہ انسان علمی سرمائے کی کثرت، وقعت اور جامعیت کو پرکھے تو وہ اس بات کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ علم و تحقیق کی دنیا میں کوئی مذہب اسلام کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اس میدان میں اسلام کا غلبہ فی الواقع کُلّی اور کامل و مکمل ہے۔''

''لیکن کیا سیاسی غلبہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں؟''

''باقی جہاں تک سیاسی اور مادی غلبے کا تعلق ہے تو تاریخ میں کم از کم دو مواقع ایسے آئے تھے جب مسلمان واضح طور پر اس مقام تک پہنچ چکے تھے کہ اگر وہ باہمی اختلاف اور مفاد پرستی سے اپنے آپ کو بچا لیتے تو آج وہ پورے کرۂ ارض کے اقتدار اور وسائل کے مالک ہوتے لیکن جبکہ دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تھا ان کو باہمی اختلاف کی نحوست نے آ جکڑا اور ذاتی مفاد کی خاطر انہوں نے اجتماعی مفاد کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اس گناہِ عظیم نے انہیں اس خیر و برکت سے محروم کر ڈالا جس کا پھل آج تک ان کی نسلیں کھا رہی ہوتیں۔''

''وہ کون سے دو مواقع تھے؟''

اس موقع پر ان دونوں تاریخی اور انقلابی لمحات کو اس مجلس میں قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا جن میں مسلمانوں نے لغزش کی اور اس کی سزا آج بھی پا رہے ہیں۔ انسان کو تقدیر کے معاملے میں ''اگر، مگر'' نہیں کرنی چاہیے کہ یہ شیطانی وساوس کا راستہ کھولتی ہے لیکن ان تاریخی حقائق کا تذکرہ اس تناظر میں کیا جا سکتا ہے کہ انسان ان غلطیوں کے اعادے سے بچ سکے جن کی المناک سزا صدیوں تک ملتی ہے۔ ہمیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ قدرت نے ہمیں کرۂ ارض پر غلبۂ کُلّی کے بھرپور مواقع نہایت فیاضی سے فراہم کئے تھے اور

آج ہم طویل مغلوبیت اور محکومیت کا جو المناک دور کاٹ رہے ہیں اور متعدد تحریکوں اور قربانیوں کے باوجود ناکامی کا اندھیرا چھٹنے نہیں پاتا، یہ سب اس اختلاف باہمی اور ذاتی مفاد پرستی کا وبال ہے۔

ان دو تاریخی اور فیصلہ کن لمحات میں سے پہلا آج سے ٹھیک چھ سو ایک سال پہلے 20 جولائی 1402ء بمطابق 16 ذی الحجہ 805ھ کو انگورہ کے میدان میں پیش آیا تھا۔ اس دن یہاں دو مسلمان تاجدار جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر عظیم فاتح اور سپہ سالار تھا، مسلمانوں کی شامتِ اعمال کے سبب آپس میں ٹکرا گئے تھے۔ ان میں سے ایک مشرق کا فاتح تھا اور دوسرا مغرب کا۔ ایک کی عظیم الشان سلطنت مشرق میں قائم تھی اور دوسرے نے مغرب میں اپنی فتوحات کے پرچم گاڑ رکھے تھے۔ اگر یہ دونوں آپس میں اتحاد کر لیتے تو بآسانی ساری دنیا پر اسلامی پرچم لہرایا جا سکتا تھا۔ ان دنوں مسلمانوں کو یہ سنہری موقع میسر تھا کہ وہ پورے کرۂ ارض پر دین اسلام کو غالب کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک یورپ میں شاندار انداز میں فتوحات کی یلغار کرتا ہوا آسٹریا، ہنگری، سوئٹزرلینڈ، جرمنی اور فرانس کو روند کر انگلستان پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی زبردست خواہش تھی...... جس کا وہ برملا اظہار بھی کرتا تھا...... کہ اٹلی کے سب سے بڑے گرجے سینٹ پیٹر میں اپنے گھوڑوں کو دانہ کھلائے۔ اس کی یلغار اتنی تہلکہ خیز ہوتی تھی کہ اسے ''یلدرم'' یعنی ''آسمانی بجلی'' کا خطاب خود اس کے جہاندیدہ والد نے دیا تھا۔ یورپ کے حکمران اس کی بہادری، بے خوفی، عسکری مہارت اور تدبیر و منصوبہ بندی سے اس قدر سہمے رہتے تھے کہ انہیں اپنا مستقبل اس کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے وابستہ دکھائی دیتا تھا۔ دوسری طرف مشرق کا نامور سپہ سالار تھا جس کی تلوار کے سامنے اپنے پرائے کسی کو ٹھہرنے کی مجال نہ تھی۔ وہ وسطی ایشیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کی آزمودہ کار فوج کے سامنے سارا ہندوستان

تھالی میں رکھی ککڑی گاجر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تو مشرق کی طرف بڑھ نکلتا اور پورے چین کو اسلامی مملکت میں شامل کر کے بحیرۂ جاپان تک جا پہنچتا اور آج کی صنعتی ترقی کے مراکز کوریا، جاپان، تائیوان، فلپائن اور سارا مشرق بعید اس کی تلوار تلے ہوتا۔ اس وقت کی معلوم دنیا بس اتنی ہی تھی۔ مشرق اور مغرب کی ان آخری حدوں پر اسلام کا پرچم بلند ہونے کے بعد ان براعظموں کو بھی اسلام کی روشنی نصیب ہوتی جو بعد میں دریافت ہوئے مثلاً امریکا اور آسٹریلیا...... مگر راستے میں انگورہ کا میدان حائل ہوگیا۔ اس جگہ اسلامی دنیا کے دو بلند مرتبہ حکمراں، دو مشہور فاتح اور دو نامور جنگ آزما آپس میں ٹکرا گئے۔ ان کا باہمی ٹکراؤ دو غضبناک شیروں کے تصادم کی مانند تھا جس کا نتیجہ یقینی طور پر ایک کے خاتمے کی شکل میں ہوتا۔ اگر یہ کسی ایک فرد یا حکومت کا خاتمہ ہوتا تو بات اتنی اَلم انگیز اور افسوسناک نہ تھی کہ کوئی بھی دوسرا فرد یا حکومت اس کی جگہ پُر کر سکتی تھی، رنج وغم اس بات کا ہے کہ اس دن اسلامی دنیا کی وہ تمام امیدیں بھی فنا ہو کر انگورہ کے میدان میں دفن ہوگئیں جو اِن دونوں عظیم فاتحین کی ذات سے وابستہ تھیں۔ ان میں سے ایک شکست کے صدمے سے چند ماہ بعد فوت ہوگیا، حالانکہ وہ 40 سال کا جوان رعنا تھا اور ابھی بہت عرصے تک اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کر سکتا تھا۔ دوسرے کو مقابل کی شکست کے بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے اس کی تلافی کی کوشش کی لیکن عمر نے وفا نہ کی، اس کی عمر 70 سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور اس طرح اس افسوسناک جنگ نے ملتِ اسلامیہ اور اسلام کی ترقی واشاعت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا جبکہ بآسانی اس سے بچا جا سکتا تھا۔

سلطان بایزید خان یلدرم (1389ء تا 1402ء) سلاطین آلِ عثمان کا نامور سپوت گزرا ہے۔ کسوو (جی ہاں! وہی کسوو جو آج مسلمانوں کے خون سے آتش زار بنا ہوا ہے اسی جگہ مسلمانوں نے یورپ کی متحدہ افواج کو عبرتناک شکست دی تھی) کے میدان میں عثمانی

افواج کی شاندار فتح کے بعد عین میدانِ جنگ میں تاج وتخت کا وارث بنا تھا۔ اس کے والد سلطان مراد اول فتح کے بعد میدانِ جنگ میں ایک قیدی عیسائی سردار کی دھوکے بازی اور مکاری سے شہید ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد سلطان بایزید کی جنگی قابلیت اور مشہور زمانہ دلیری و بہادری کے سبب تمام ترک سرداروں نے اسے میدانِ جنگ میں ہی بالاتفاق سلطان تسلیم کر کے اس کی صلاحیت اور قابلیت کا اعتراف کر لیا تھا۔

اس نے کسوو کی جنگوں میں انتہائی جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کیا تھا اور عین اس وقت جب ترک افواج کے قدم اکھڑنے لگے تھے، یہ اپنا آہنی گرز لے کر یورپی عیسائیوں کی فوج میں گھس گیا اور کشتوں کے پشتے لگا کر عیسائی سورماؤں کو جو اپنی فتح کو یقینی سمجھ چکے تھے، فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس سے قبل اس نے ایک مشکل معرکہ میں اس سرعت اور تیز رفتاری سے دشمن پر حملہ کر کے اسے تہس نہس کر دیا تھا کہ اس کے باپ نے خوش ہو کر اسے یلدرم (ترکی میں ''آسمانی بجلی'' کو یلدرم کہتے ہیں) کا خطاب دیا تھا۔ جو بعد میں اس کے نام کا حصہ بن گیا۔

یہ پہلا عثمانی حکمران تھا جس نے مصر کے عباسی خلیفہ مستعصم باللہ سے اپنے لیے سلطان کا خطاب حاصل کیا۔ اس سے قبل کے عثمانی فرمانروا ''امیر'' کہلاتے تھے (اگرچہ مؤرخین نے انہیں بھی سلاطین ہی لکھا ہے) اس طرح ''خلافت'' عثمانیہ کی بنیاد میں اس سلطان کی تدبیر اور اہلیت کا بڑا دخل تھا۔

جنگ کسوو میں فتح کے بعد عثمانی غازیوں کے لیے ہنگری راستے میں پڑے پتھر کی مانند ہو گیا تھا جسے وہ جب چاہتے ایک ٹھوکر سے اپنی سلطنت میں شامل کر لیتے۔ ذرا یورپ کا نقشہ دیکھیے! ہنگری کے بعد رہ ہی کیا جاتا ہے۔ سوئزرلینڈ، فرانس اور پھر آگے اسپین جہاں پہلے ہی مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اس طرح یورپ کے مشرق ومغرب سے مسلمان اسے

روند کر فتح کر لیتے اور بعد کی صدیوں میں یورپی استعمار کے ہاتھوں محکومیت کی اس ذلت سے محفوظ رہ سکتے تھے جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس وقت ہنگری کے بادشاہ سجسمنڈ نے تمام اہل یورپ اور پوپ اعظم سے مدد کی اپیل کی۔ چونکہ سب کو اپنا وجود خطرے میں محسوس ہو رہا تھا اس لیے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا گیا اور تمام یورپ کے نامور سورما مذہبی اور قومی جوش و جذبے سے ہنگری کے دفاع اور یورپ کو ترک مجاہدین سے آزاد کروانے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ یہ بہت بڑا عیسائی اتحاد تھا اور اس میں شریک کمانڈروں کو اپنی فتح کا اس قدر یقین تھا کہ وہ نعوذ باللہ یوں ڈینگیں مارتے تھے:

''اگر آسمان بھی ان کے اوپر گرا تو وہ اسے اپنے نیزوں پر تھام لیں گے۔''

انہوں نے فتح کے جشن کے لیے ناچ گانے والی عورتوں کو بھی ساتھ لایا ہوا تھا، جن کی عشوہ طرازیوں کے سبب فوجی قرارگاہ کسی نشاط انگیز تفریح گاہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ سلطان بایزید اس زمانے میں ایشیائے کوچک (کوچک بمعنیٰ چھوٹا، موجودہ ترکی، آرمینیا اور آذربائیجان وغیرہ کے علاقے کو ایشیائے کوچک کہتے تھے) گیا ہوا تھا۔

صلیبی لشکر کا ارادہ تو یہ تھا کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں عثمانی دارالخلافہ کو روندتے ہوئے شام جا پہنچے اور پھر فلسطین پر قبضہ کر کے بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھین لے لیکن وہ راستے میں نکوپولس کے قلعے میں الجھ کر رہ گئے۔ یہاں کے ترک کمانڈر یوغلنبیگ نے حیرت انگیز اور زبردست مزاحمت کے ذریعے اس عیسائی سیلاب کو یورپ میں ہی اس وقت تک الجھائے رکھا جب تک کہ سلطان بایزید اپنی برق رفتار فوج کے ساتھ وہاں پہنچ نہ گیا۔

سلطان کی سرعت اور تیز رفتار نقل و حرکت ویسے ہی ضرب المثل تھی وہ اپنے بہادر سردار کی وفاداری سے متاثر ہو کر آندھی اور طوفان کی طرح نکوپولس آ پہنچا اور اس عظیم الشان لشکر کو اس کے گھر میں گھیر لیا جو اگر عثمانی علاقوں میں سلطان کی بے خبری میں پہنچ جاتا تو

زبردست نقصان ہوتا۔

نکوپولس موجودہ جغرافیے میں............ میں واقع ہے اور اسی نام سے مشہور ہے۔

[1] 23 ذی قعدہ 798ھ بمطابق 24 ستمبر 1396ء کو عیسائی سورما دریائے ڈینیوب کے کنارے اسی میدان میں دسترخوان پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ اچانک انہیں یہ اطلاع ملی کہ سلطان بایزید خان کی افواج قریب آ پہنچی ہیں۔ ان کو اس غیر متوقع آفت سے بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے اپنی کثرت اور طاقت کے بل بوتے پر دل میں پکا خیال جما لیا تھا کہ سلطان آبنائے باسفورس کو عبور کرنے کی جرأت بھی نہ کرے گا مگر یہاں صورت حال یہ تھی کہ وہ ان کے گھر میں ان کے سر پر آ پہنچا تھا۔ مؤرخین کے مطابق صلیبی لشکر کے لیے یہ بات خصوصیت سے تذکرہ کرنے کے قابل ہے کہ اس میں جس قدر عیسائی افواج مختلف یورپی سمتوں سے جمع ہوئی تھیں، وہ سب کی سب نہایت تجربہ کار اور بارہا کے جنگ آزمودہ سپاہیوں اور سالاروں پر مشتمل تھیں۔ اس وقت گویا سارے یورپ کے بہترین اور منتخب جنگجو مسلمانوں کو یورپ سے نکالنے کے لیے صلیبی جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے اور بیت المقدس سے پہلے کسی مقام پر رکنے کو آمادہ نہ تھے۔

سلطان بایزید خان اپنے 40 ہزار مجاہدوں کو ڈیڑھ لاکھ سے زائد جنگجوؤں پر مشتمل مکمل لشکر سے لڑانے کا فن جانتا تھا۔ اس نے اپنی باقاعدہ فوج پیچھے رکھی اور ''ینی چری'' (عثمانی افواج کے مشہور زمانہ کمانڈوز دستے) اور سواروں کا ایک دستہ آگے بڑھایا۔ عیسائیوں نے انہیں لقمۂ تر سمجھتے ہوئے زوردار ہلّہ بولا اور آسانی سے انہیں چیرتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ آگے جا کر انہیں عثمانی افواج کا باقاعدہ دستہ ترتیب سے کھڑا ہوا نظر آیا۔ اب انہیں غلطی کا احساس ہوا لیکن وہ جوش میں اتنے آگے چلے گئے تھے کہ اب واپسی مشکل تھی۔ آگے سلطان کی تربیت یافتہ تازہ دم فوج تھی اور پیچھے وہ دستے جنہوں نے ان

جنگجوؤں کو آگے جانے کا راستہ فراہم کیا تھا۔ عثمانی مجاہدین نے ان ''پُر جوش'' جنگجوؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ سب کے سب مارے گئے جو بچے قید کر لئے گئے۔ پھر سلطان بایزید، شاہ ہنگری بجسمنڈ کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ متحدہ افواج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر یہ جنگ تین گھنٹے سے آگے نہ چل سکی۔ اتحادیوں کو بری طرح شکست ہوئی۔ ان کے ہزاروں سپاہی مسلمانوں کی خوں آشام تلواروں سے کٹ کر خاک وخون میں مل گئے اور دس ہزار گرفتار ہوئے جن میں فرانس، آسٹریلیا، ہنگری کے بڑے بڑے نواب، شہزادے اور سپہ سالار شامل تھے۔

نکوپولس کی اس جنگ میں عیسائیوں کا ایسا لشکر سلطان کے مقابلے میں جمع ہوا تھا جو ہر اعتبار سے مکمل اور مضبوط تھا۔ اس سے پہلے عیسائیوں کی ایسی زبردست طاقت جمع نہ ہوئی تھی مگر سلطان بایزید نے اس کو شکستِ فاش دے کر یورپ کی کمر توڑ ڈالی۔ یورپ کے چپے چپے پر اس کی دھاک بیٹھ گئی اور متحدہ یورپ کے شکست خوردہ حکمرانوں کو یقین ہو گیا کہ سلطان بایزید نے روم کے سب سے بڑے گرجے میں اپنے گھوڑوں کو دانہ کھلانے کا جو عزم ظاہر کیا ہے، وہ ضرور اس کو پورا کر کے رہے گا۔ بایزید کے لیے اب اس خواہش کی تکمیل کوئی مسئلہ نہ رہی تھی لیکن اس نے یورپ کی طرف بڑھنے سے پہلے قیصر قسطنطنیہ کا قصہ پاک کرنا ضروری سمجھا کیونکہ یہ بار بار کے معاہدے کے باوجود ہمیشہ عہد شکنی کر کے دشمنوں سے مل جاتا تھا اور اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ قیصر نے اس کے خلاف امیر تیمور سے مدد طلب کی ہے۔

چنانچہ اس نے بلا تکلف آگے بڑھ کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ قسطنطنیہ کو فتح کر کے مسلمانوں کا صدیوں پرانا خواب پورا کر سکتا تھا اور قسطنطنیہ کا مضبوط قلعہ سرنگوں ہونے کے بعد پاپائے روم کا مرکزی کلیسا اس

کے گھوڑوں کی اگلی منزل ہوتا جس کے بعد وہ شکست خوردہ یورپ کو روندکر سیدھا ارود بار انگلستان پہنچ کر دم لیتا اور ہسپانیہ کی دم توڑتی مسلم سلطنت میں نئی جان پڑ جاتی مگر عین اس وقت جب اس جواں سال اور باہمت سلطان کے نیک ارادے تکمیل پا کر کرۂ ارض کا نقشہ بدلنا چاہتے تھے، عالمِ اسلام نے یہ غمناک خبر سنی کہ مشرق کا بوڑھا جنگجو امیر تیمور لنگ، سلطان بایزید سے دودو ہاتھ کرنے کے لیے ایشیائی ملکوں کو روندتا ہوا ترکی کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔

یورپ کی دو تدبیریں

امیر تیمور لنگ جفاکشی، سفاکی اور خون ریزی میں اپنے جدِّ اعلیٰ چنگیز خان سے مشابہ تھا۔ چنگیز خان اسلام کا دشمن اور تیمور لنگ اسلام کا مدعی تھا مگر عملاً دونوں اس اعتبار سے یکساں رہے ہیں کہ دونوں کی تلوار عمر بھر مسلمانوں کا خون بہاتی رہی۔ چنگیز خان کے ہاتھوں سلطنتِ بغداد کا چراغ گل ہوا اور تیمور نے یورپ میں وہ شمع روشن نہ ہونے دی جس کی کرنیں آج امریکا و آسٹریلیا کو منور کر رہی ہوتیں۔

قیصر قسطنطنیہ نے بھی بھانپ لیا تھا کہ سلطان بایزید خان میں وہ دم خم ہے کہ یہ اس کے شہر کی ان فصیلوں پر ہلالی پرچم لہرا کر چھوڑے گا جو اب تک ناقابلِ تسخیر ثابت ہوئی تھیں، لہٰذا اس نے وہ دونوں تدبیریں آزمائیں جو عیسائی سورماؤں کا وطیرہ رہی ہیں یعنی مسلمانوں کو اخلاقی لحاظ سے کمزور کرنا اور ان میں اختلاف پیدا کر کے آپس میں لڑوانا۔ جنگ کسوو کے بعد سرویا کے بادشاہ نے بکمالِ عجز و نیاز بایزید کا باج گزار بن کر اپنی بہن اس کے حرم میں داخل کر دی تھی۔ یورپی حکمرانوں کی بھیجی گئی ان نازک اندام شہزادیوں کا مشن یہ تھا کہ وہ کسی طرح عثمانی فرمانرواؤں کو عیاشی، شراب خوری اور آرام پرستی کی لت لگا دیں،

لہٰذا وہ بہادر حکمران جو میدانِ جنگ میں طاقتور سے طاقتور دشمن کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ان ''بنات الصلیب'' سے جو ''حبائل الشیطان'' کا کردار ادا کر رہی تھیں، مغلوب ہوتے چلے گئے۔ ان عیسائی دوشیزاؤں کی اولین کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرح ان مجاہد اور درویش صفت سلاطین کے ہونٹوں کو شراب سے آلودہ کر دیا جائے، پھر اخلاقی پستیوں میں وہ خود ہی گرتے چلے جائیں گے کیونکہ حرام نوشی اور حرام کاری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

یورپی مؤرخین نے فخر کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ بایزید عثمانیوں میں وہ پہلا حکمران ہے جو باوجود بہادر، جفاکش اور سپاہیانہ مزاج رکھنے کے یورپ کی خفیہ تدبیروں کا شکار ہو کر شراب نوشی کے جرم کا مرتکب ہوا اور جو کام یورپ کے فوجی اور سپہ سالار نہ کر سکے تھے وہ اس کی عصمت باختہ حسیناؤں نے کر دکھایا۔

قیصر کی دوسری تدبیر مسلمانوں کی سادگی اور غیروں کی عیاری کی شاہکار مثال ہے۔ اس نے بڑی عاجزی اور لجاجت کے ساتھ امیر تیمور کو اپنی خیر خواہی کا یقین دلاتے ہوئے سلطان بایزید کے بارے میں ایسا خط لکھا کہ مخالفین کے لیے دہشت اور قوت کا نشان امیر تیمور اس کے جال میں آ گیا۔ اس نے بڑی دلسوزی سے تیمور کی توجہ اس طرف دلوائی کہ آپ کے لیے اس وقت ہندوستان فتح کرنے سے زیادہ اہم چیز سلطان بایزید سے انتقام لینا ہے۔ آپ کی غیرت اور بہادری پر یہ چیز داغ رہے گی کہ اس نے آپ کے دو باغی سرداروں (احمد جلائر اور یوسف ترکمان) کو پناہ دے رکھی ہے جو آپ کی بے عزتی کے مترادف ہے۔

وہ یورپ میں اپنی فتوحات بڑھانے کے بعد آپ کے ملک پر حملہ آور ہوگا اور فاتح عالم کہلائے گا۔ اس وقت سے قبل آپ کو اس کی ایشیائی مقبوضات پر حملہ کر دینا چاہیے کیونکہ یہ علاقہ قدرتی طور پر اس قابل ہے کہ آپ کی سلطنت میں شامل رہے۔ اس بارے میں ہم

سے جو خدمت ہو سکے آپ ہم کو اس کے لیے حاضر پائیں گے۔ قیصر کی اس طرح کی باتوں نے تیمور کے دل میں اندر ہی اندر ایسا اثر پیدا کیا کہ اس کا دل ہندوستان سے اچاٹ ہو گیا۔ اغیار کا جادو سر چڑھ چکا تھا، ہندوستان کا پُراسرار حسن اور بیش بہا خزانے تیمور کے لیے کسی قسم کی کشش سے عاری ہو چکے تھے اور بایزید کو نیچا دکھائے بغیر اسے اپنی زندگی بیکار اور پھیکی پھیکی محسوس ہونے لگی تھی۔

اس وقت تک وہ دلّی کو فتح کر کے خاک کر چکا تھا اور دریائے گنگا کے کنارے ہردوار میں پڑاؤ ڈال کر مشرقی ہندوستان کی طرف بڑھنا چاہتا تھا جس کے بعد اس کی تلوار کا رخ اس کے اپنے آبائی علاقہ منگولیا اور پھر چین، جاپان، کوریا، تائیوان وغیرہ مشرق بعید کے ممالک کی طرف ہوتا...... مگر عیسائیت کا وار کام کر چکا تھا۔ اس نے نئے نئے قبضہ میں آئے ہوئے ہندوستان کو بغیر نظم و نسق کے بیوہ سہاگن کی طرح اجڑا ہوا چھوڑا اور پنجاب کے راستے سے سمرقند کی راہ لی۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ ہندوستانی قیدی تھے۔ اب وہ بھی اسے بار لگتے تھے، اس نے ان سب کی گردن مروا دی اور اپنے پایہ تخت سمرقند پہنچ کر بایزید سے پنجہ لڑانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ اس پر اب یہی دھن سوار تھی کہ بایزید سے دو دو ہاتھ کر کے اس بات کا فیصلہ کر لیا جائے کہ ہم دونوں میں سے دنیا کا فاتح بننے اور کہلوانے کا حقیقی مستحق کون ہے؟

تقریباً دو سال قبل بندہ نے ''شیروں کا ٹکراؤ'' نام سے لکھے گئے مضمون میں اس المناک معرکے کی کچھ تفصیل لکھی تھی، اس وقت ایک بریگیڈیئر صاحب جو عسکریت اور عسکری تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے، کا خط موصول ہوا تھا جس میں انہوں نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چند صفحوں کا عکس بھیجا تھا جس میں ان سطور کو خط کشیدہ کیا گیا تھا جن کے مطابق مقالہ نگار نے اس امر کا اعتراف اور تصدیق کی تھی کہ امیر تیمور اور سلطان بایزید کی باہمی

جنگ عیسائی منصوبہ سازوں کی خفیہ تدبیروں کا نتیجہ تھی۔ مسلمانوں کی سادگی کوئی نئی بات نہیں مگر افسوس اس پر کہ عیسائی مؤرخین نے قیصر کی اس فریب کاری پر یوں تبصرہ کیا ہے: ''جنگِ انگورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ بالآخر عیسائیوں کے ساتھ ہے۔'' حسین دوشیزاؤں اور جھوٹ وفریب کے ذریعے حاصل ہونے والی کامیابی کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا نتیجہ قرار دینا بہت کمتر درجے کی بات ہے۔

الغرض قصہ مختصر 20 جولائی 1402ء کو وہ المناک دن آ پہنچا جب ملتِ اسلامیہ کی امیدوں کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ اس دن انگورہ کے میدان میں لڑی گئی جنگ تاریخِ اسلام کی افسوسناک ترین جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ مسلم مؤرخین کا قلم یہاں پہنچ کر سیاہ خون کے قطروں سے غم والم کے نقوش ثبت کرتا نظر آتا ہے۔ امیر تیمور جب سمرقند سے چلا تو اس کے ساتھ پانچ لاکھ سے زیادہ کا عظیم الشان لشکر تھا۔ اس نے انگورہ کے میدان میں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔

بندہ کو جغرافیہ کی قدیم وجدید کتابوں میں انگورہ کا محل وقوع صراحۃً تو نہیں ملا البتہ ڈاکٹر حسین مؤنس کی کتاب ''اطلس تاریخ الإسلام'' میں یہ لفظ تھے: ''ووقعت المعركة الفاصلة بين الأمتين عند أنقرة.'' (ص: 385) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ ترکی کے دارالحکومت انقرہ سے قریب تھی۔ ممکن ہے انقرہ، انگورہ کی بدلی ہوئی شکل ہو۔ سلطان بایزید خان کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی جس میں سے اکثریت کو وہ قسطنطنیہ کے محاصرے سے ہٹا کر لایا تھا۔ دونوں طرف منجھے ہوئے آزمودہ کار اور جنگ آزما سپاہی تھے اور جیسا کہ عیسائیوں کو توقع تھی بہت زوردار اور خونریز معرکہ لڑا گیا۔

سلطان بایزید نے سپہ گری اور سپہ سالاری کے خوب خوب جوہر دکھائے، فتح یورپ کے لیے اس کی تیار کردہ خصوصی فوج نے بھی غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ ایک اور پانچ

(بعض مؤرخین نے امیر تیمور کی فوج کی تعداد آٹھ لاکھ بتائی ہے مگر پانچ سے چھ لاکھ کے درمیان تو یقینی ہے) کا مقابلہ تھا، اگر سامنے کافر فوج ہوتی تو آج دنیا کی تاریخ میں ان عظیم الشان جنگوں میں ایک نام کا اضافہ ہو جاتا جن میں تھوڑی فوج نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کو شکست دی تھی مگر اس دن دونوں طرف مسلمان تھے لہٰذا قلت کثرت پر غلبہ پانے کی بجائے اس کے ہاتھوں رُل کر رہ گئی۔ سلطان بایزید کی قوتِ فیصلہ اور شجاعت وحکمت آج بھی پہلے کی طرح تھی مگر تیمور بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس نے اب تک ساری زندگی گھوڑے کی پیٹھ پر گزارتے ہوئے اعلیٰ ترین فوجی قابلیت کا مظاہرہ کیا تھا اور آج کے دن عثمانی فوج کی طرف سے کئی مرتبہ تیموری لشکر کی صفیں توڑے جانے کے باوجود اس بوڑھے سالار کے حواس بحال تھے، قوتِ فیصلہ پختہ تھی اور وہ نہایت عمدگی سے برموقع ہدایات جاری کررہا تھا۔ بالآخر سورج ڈوبنے تک اس جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔

دونوں مسلمان فریقوں میں سے بظاہر ایک نے فتح پائی لیکن درحقیقت دونوں ہار گئے تھے اور فتح صرف یورپ کی ہوئی تھی جس نے سکون کا سانس لیا اور اس کے نیم مردہ جسم میں پھر سے جان پڑ گئی۔ ان دو عظیم المرتبت سپہ سالاروں کا آپس میں الجھنا ان ہی کی نہیں سارے عالمِ اسلام کی پسپائی کا سبب ثابت ہوا۔ یہ دونوں بے نظیر صلاحیتوں اور جوہرِ قابل کے مالک تھے۔ جس طرح مشرق میں تیمور کا کوئی مقابل نہ تھا اسی طرح مغرب کی کوئی طاقت بایزید یلدرم کی ٹکر نہ سنبھال سکتی تھی۔ مسلمانوں کی ایک عظیم بادشاہت مشرق میں اور دوسری مغرب میں قائم تھی اور ظاہری حالات وقرائن صاف بتاتے تھے کہ بحرالکاہل سے بحراوقیانوس تک مسلمانوں کی عظیم حکمرانی کا قیام بس چند سال کی بات ہے مگر یہ دونوں اولوالعزم فاتح اور بہترین جرنیل، عیسائیت کے پھینکے ہوئے جال میں الجھ گئے۔ یہ اگر انانیت اور عداوت کا شکار نہ ہوتے اور ایک دوسرے کو طرح دے جاتے تو ان کا کچھ بھی نہ

بگڑتا البتہ جس مذہب کے یہ نام لیوا تھے اس کا اور اس کے ماننے والوں کا پورے کرۂ ارض پر بول بالا ہو جاتا مگر مسلمانوں کو ان کی بداعمالی کی سزا بھی تو ملنی تھی چنانچہ بایزید کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔

سلاطین آلِ عثمان کا یہ جوانمرد سپوت چونکہ غیر معمولی طور پر غیرتمند اور حساس تھا اس لیے شکست اور قید کی ذلت نہ سہہ سکا۔ کہاں وہ بلند ہمت اور جوانمرد جو یورپ کے سپہ سالاروں کو آزاد کر کے انہیں کہا کرتا تھا میں تم سے تمہارے شہروں میں آ کر لڑوں گا، تم ناحق یہاں آنے کی زحمت کیوں کرتے ہو اور کہاں یہ بے بسی اور لاچاری کا عالم کہ اس کے اپنے ہم مذہب نے بغیر کسی بڑی وجہ کے اس کا لشکر تتر بتر کر دیا، سلطنت کے حصے بخرے کر کے مقامی سرداروں میں تقسیم کر دیے اور اسے اس کے بیٹے سمیت قید کر کے ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔ سلطان بایزید خان نے فرار کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ تیمور اسے ایک جگہ رکھنے کی بجائے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا جسے بایزید جیسا خوددار شخص برداشت نہ کر سکتا تھا۔ آٹھ ماہ بعد ہی وہ اس دنیا کی بے ثباتی کا مشاہدہ کرتے کرتے حسرت و یاس کے عالم میں جان سے گزر گیا۔ اگر انگورہ میں تیمور کو شکست ہوتی تو صرف اسی کو ہوتی، اس کے مقبوضہ ممالک کے مسلمانوں اور اسلام کا کچھ نہ بگڑتا مگر سلطان بایزید کی شکست مسلمانوں کی ان تمام تمناؤں اور کوششوں کے حسرتناک خون کی شکل میں سامنے آئی جو وہ فتح یورپ کے حوالے سے ایک عرصہ سے دل میں رکھتے تھے۔

روایت ہے کہ تیمور جیسا سنگدل جس نے لاکھوں انسانوں کو اپنے سامنے مروایا تھا، اس جوانمرد اور جواں عمر سلطان کی موت پر اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا، اس کا دل بھر آیا اور آنکھ سے نکلنے والے آنسوؤں نے گواہی دی کہ وہ اپنی غلطی پر رنجیدہ ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اس نے بایزید کی نعش عزت و احترام کے ساتھ اس کے بیٹے کے سپرد کی اور اسے رہا

کردیا تا کہ وہ اپنے عظیم باپ کو بروصہ لے جا کر عثمانی سلاطین کے پہلو میں سپرد خاک کر سکے۔ اپنی غلطی کی تلافی کے طور پر اس نے چین کی فتح کا ارادہ کیا مگر اس کی عمر 70 سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ وقت ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ اس سے یہ مہم سر نہ ہو سکی اور دو سال بعد وہ بھی اس دنیائے ناپائیدار سے منہ موڑ گیا۔ اس طرح وہ دو حوصلہ منداور فاتح حکمران جو آپس میں اتحاد کر کے ساری دنیا پر اسلام کا پرچم لہرا سکتے تھے، باہمی اختلاف کے وبال کا شکار ہو کر اپنے پیچھے ایسی دنیا چھوڑ گئے جس میں بسنے والی ان کی اولاد آج دشمنوں کے رحم و کرم پر ہے اور قدرت کی طرف سے بار بار کی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمنوں کو اور ان کی چالوں کو سمجھنے پر آمادہ نہیں۔ کسی زمانے میں مسلمان ایسے بلند مرتبہ ہوتے تھے کہ انہیں زیر دام لانے کے لیے یورپ کو اپنی شہزادیاں بھیجنی پڑتی تھیں، اب دشمن کا کام اتنا مشکل نہیں، بازاری عورتوں کی تصویریں ہی مسلمان نوجوانوں کو ورغلانے اور بہکانے کے لیے کافی ہیں۔ یورپ کی برآمد کردہ فحاشی، بے حیائی اور باہمی عداوت اور چپقلش نے کیسی بلندی سے اٹھا کر کس پستی میں ہمیں دے مارا مگر ہم اب بھی اسی عطار سے دوا لینے پر مصر ہیں جس کی کرم فرمائیوں کے سبب اس حال کو پہنچے۔

لمحوں کی خطا

ذکر ایک دن کا:

یورپ آج کل جدید علوم اور ہوشربا سائنسی ترقی کا گڑھ سمجھا جاتا ہے، اور چونکہ یہاں کا مذہب عیسائیت ہے تو اس واسطے سے عیسائیت دنیا کا بڑا مذہب اور اسلام کا ایک بڑا مدمقابل ہے۔ لیکن قارئین کیا آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ میں ایک وقت ایسا آ گیا تھا کہ قریب تھا کہ مشرق میں چین، جاپان کے علاوہ تائیوان، فلپائن، کوریا وغیرہ اور مغرب میں سارا یورپ اسلام کے زیر سایہ آ جاتا اور چونکہ امریکا کو یورپی اقوام نے آباد کیا ہے اور یہی لوگ عیسائیت اور یہودیت کو وہاں متعارف کروانے کا سبب بنے ہیں، لہٰذا اگر یورپین مسلمان ہوتے تو امریکا پر بھی آج اسلام کا پرچم لہرا رہا ہوتا۔ لیکن نویں صدی ہجری میں ایک دن ایسا آیا کہ سورج طلوع ہوا تو حالات کچھ اور تھے لیکن غروب ہوا تو اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر ڈوب گیا۔ صبح سے شام تک ایک ہی دن میں اسلام کو اتنا زبردست نقصان پہنچا کہ روئے زمین کا ایک بڑا حصہ...... مغرب میں پورا یورپ و امریکا اور مشرق میں چین جاپان وغیرہ...... اسلام کی دولت سے فیضیاب ہونے سے محروم ہو گئے۔ اس قسط میں ہم اسی جگر

خراش واقعے اور اسی دلسوز دن کا تذکرہ کریں گے۔

گنگا سے خلیج فارس تک:

آٹھویں صدی ہجری کے اختتام اور نویں صدی ہجری کے آغاز میں عالم اسلام کا منظر نامہ کچھ یوں تھا کہ روئے زمین پر دو عظیم اسلامی سلطنتیں قائم تھیں۔ برصغیر اور وسط ایشیا میں مشہور فاتح تیمور لنگ حکمران تھا۔ اس کی سلطنت دیوار چین سے لے کر بحیرہ کیسپین کے پاس جارجیا تک اور دریائے گنگا سے لے کر خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کے ابتدائی سال اپنے ہمسایہ تاتاری امراء سے جنگ کرنے میں گذرے۔ پینتیس سال کی عمر میں اس نے ان سب کو زیر کر کے سمرقند کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کے بعد فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جس کی وسعت کے سامنے سکندر، چنگیز خان اور نپولین کی سلطنتیں حقیر معلوم ہوتی ہیں، اس نے پینتیس سال سے کم مدت میں ستائیس مملکتیں فتح کر لی تھیں اور نو شاہی خاندانوں کو فنا کر دیا تھا۔ اس کی یہ حیرت انگیز جہانگیری صرف ذاتی شجاعت اور اعلیٰ فوجی قابلیت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اس کے تدبر اور ملکۂ حکمرانی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا، اس کا مجموعۂ قوانین جسے اس نے فوج، عدالت اور مالیت کے انتظام کے لیے مرتب کرایا تھا، اس کے تدبر اور صحیح غور و فکر کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کے جاسوس مختلف بھیسوں میں خصوصاً زائرین اور درویشوں کے لباس میں ہر طرف گھومتے رہتے تھے اور ان کی مکمل رپورٹیں احتیاط کے ساتھ دفتر میں درج کی جاتی تھیں۔ اس طرح تیمور کو اپنے دشمنوں کی قوت اور کمزوری کی صحیح اطلاع بہم پہنچتی رہتی تھی، اسے اپنے سپاہیوں پر اس قدر اقتدار حاصل تھا کہ وہ اس کے حکم پر نہ صرف بڑی سے بڑی سختی برداشت کرنے اور اپنی جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، بلکہ عین فتح کے موقع پر اگر وہ حکم دیتا تو لوٹ مار سے بھی ہاتھ کھینچ لیتے اور مال غنیمت سے دست بردار ہو جانے میں قطعاً پس و پیش نہ کرتے۔ اپنے ماتحتوں کے ساتھ اس

کا سلوک شریفانہ اور فیاضانہ تھا، لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرتے انہیں سخت سزائیں دیتا، اسی وجہ سے مؤرخین نے تبصرہ کیا ہے کہ تیمور نے دہشت انگیزی کو بھی فتح کا ایک خاص ذریعہ بنا رکھا تھا، اور جو سزائیں وہ دیتا تھا ان سے اکثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی فوری اشتعال کا نتیجہ نہ تھیں بلکہ پہلے سے سمجھ بوجھ کر طے کی گئی تھیں۔ بہر حال دنیا پر اس کی دھاک بیٹھے ہوئے تھی۔ بڑے بڑے بادشاہ اس کی دہشت سے کانپتے تھے اور وہ ملک پر ملک فتح کرتا چلا جاتا تھا۔

آسمانی بجلی:

دوسری طرف یورپ کی سرحد پر (یورپ وایشیا کے سنگم پر واقع قیصر کی مملکت کو بازنطینی مملکت کہا جاتا تھا) بحر روم سے بحر اسود تک سلطنت عثمانیہ قائم ہو چکی تھی جس کی سربراہی اس وقت سلاطین آل عثمان کے نامور سپوت سلطان بایزید یلدرم کے ہاتھ میں تھی۔ ترکی زبان میں ''یلدرم'' کے معنی ''بجلی'' کے ہیں۔ سلطان بایزید فطری طور پر بے حد دلیر اور بہادر تھا اور جنگ کے دوران کسی صاعقۂ آسمانی کی طرح دشمنوں پر ٹوٹتا تھا، اس لیے اسے ''یلدرم'' کا خطاب ملا تھا۔ اس نے اپنے والد سلطان مراد خان کی زندگی میں مختلف مواقع پر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ خاص کر جنگ کسوو (جی ہاں! وہی کسوو جو آج جہاد اور ہجرت ونصرت جیسے اعمال چھوڑ دینے کی وجہ سے ستم کدہ بن گیا ہے، وہیں مسلمانوں نے پورے یورپ کی متحدہ صلیبی فوج کو عبرتناک شکست دی تھی) جس میں سارے یورپ سے صلیبی افواج اکٹھی ہو کر مسلمانوں سے جنگ کے لیے آئی تھیں، میں اس نے غیر معمولی بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کر کے اتحادی افواج کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ اس جنگ کے اختتام پر اس کے والد سلطان مراد ایک عیسائی سردار کے دھوکہ اور فریب سے شہید ہو گئے۔ ہوا یوں کہ شکست خوردہ عیسائی افواج میں سے سرویا (موجود سربیا) کے ایک سردار

نے بھاگتے بھاگتے گھوڑا موڑا اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ مجھے زندہ گرفتار کر کے اپنے سلطان کے پاس لے چلو۔ میں عیسائیوں سے متنفر ہوں اور سلطان کو بعض اہم اور نہایت ضروری راز کی باتیں بتانا اور دین اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ جب خاص قیدی سلطان کی خدمت میں باری باری پیش ہونے لگے تو اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر سلطان کے پاؤں پر رکھ دیا، لیکن اچانک اٹھا اور ایک خنجر سے سلطان پر حملہ کر دیا۔ سپاہیوں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن سلطان کو کاری وار لگ چکا تھا۔ جنگ کے اختتام پر جب شہزادہ بایزید فاتحانہ واپس آ کر والد کی دست بوسی کے لیے حاضر ہوا تو اس کی خوشی کا رنگ اس واسطے پھیکا پڑ چکا تھا کہ والد شہادت کے قریب تھے۔ والد کی شہادت پر شہزادہ بایزید کو اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کے اعتراف میں میدان جنگ ہی میں باتفاق امراء وارکان سلطنت تخت نشین کیا گیا۔ جنگ کسوو (جس کے نتیجے میں موجودہ کسووا اسلامی خلافت میں شامل ہوا) مسلمانوں کی یوروپینز کے ساتھ عظیم الشان لڑائیوں میں سے سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس سے قبل بازنطینی اکیلے ہی سلطنت عثمانیہ سے ٹکراتے تھے۔ اس جنگ میں پہلی مرتبہ یورپ کے سورما متحد ہو کر مسلمانوں کو پیسنے آئے تھے مگر خود بری طرح ملیامیٹ ہو گئے۔ شام و فلسطین پر قبضے کا خواب دیکھنے کی بجائے انہیں اپنے ممالک بچانے کی فکر پڑ گئی۔

قدموں کی آہٹ:

عثمانی سلطنت کے تخت کو سلطان بایزید جیسا غیر معمولی شجاع، مدبر، نیک اور دور اندیش سربراہ نصیب ہو چکا تھا۔ اسے یورپ کے عیسائیوں سے جہاد کا خاص شوق تھا۔ وہ چاہتا تو ایران وخراسان، آذربائیجان اور آرمینیا کی طرف متوجہ ہو کر عظیم فتوحات حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اسے ملک گیری کی ہوس نہ تھی۔ اپنے پیش رو عثمانی سلاطین کی طرح اس میں دین داری بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ مسلمان سرداروں کی بغاوت کی خبریں ملنے کے باوجود

مسلمانوں سے لڑنے کو اچھا نہیں سمجھتا تھا اور اپنے آباء واجداد کے اس اصول پر کار بند رہتا تھا کہ باہمی چپقلشوں میں پڑ کر اپنی طاقت ضائع کرنے کی بجائے یورپ کے عیسائیوں کے خلاف جہاد کر کے جہاں تک ممکن ہو غیر مسلم ممالک کو فتح کیا جائے اور اسلامی تہذیب کی اشاعت سے یورپ کے ظلمت کدہ میں ہدایت کی کرنیں پھیلائی جائیں۔ چنانچہ اپنی تخت نشینی کے دوسرے سال (793ھ) میں جب اس نے سنا کہ یورپی مفتوحہ علاقوں میں شورش پیدا ہو رہی ہے اور سربیا اور بوسنیا کے علاقوں میں اسباب بغاوت قوی ہوتے جا رہے ہیں تو اس کا شوق جہاد بڑھک اٹھا۔ وہ طوفان برق و باد کی طرح یورپ (جی ہاں! موجودہ دور کی سپر طاقتوں پر مشتمل یورپ) میں داخل ہوا اور بوسنیا سے دریائے ڈینوب (یورپ کا مشہور ترین دریا) تک کے تمام علاقے کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کو دریائے فرات سے دریائے ڈینوب تک پھیلا دیا۔ اس کے بعد اس نے جو مسلسل فتوحات حاصل کیں وہ تاریخ اسلام کا روشن باب ہیں۔ سربیا، فلاڈلفیا، ولاچیا، بلغاریہ، رومانیہ، آسٹریا، یونان کون سی جگہ تھی جو اس کی یلغار کے سامنے ٹھہرتی؟ خوش قسمتی سے اسے بہادر اور قابل لڑکے نصیب ہوئے تھے نیز ماہر ترین ترک سپہ سالاروں کی خدمات اسے حاصل تھیں جو اس کے عدل و انصاف اور جنگی قابلیت کی وجہ سے دل و جان سے اس کے وفادار اور اطاعت گذار تھے اور چونکہ بادشاہ فطرتاً خود دلیر تھا اور دلاور لوگوں کو پسند کرتا تھا اس لیے اس کا ہر فوجی کمانڈر اور جوان میدان جہاد میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مردانگی کے جوہر دکھاتے تھے اور یوں پورا یورپ سلطنت عثمانیہ کے قدموں کی آہٹ سن کر لرز رہا تھا۔

دن بھر میں:

اس کی فوجیں آسٹریا سے گذرتے ہوئے ہنگری کی دیواروں تک جا پہنچی تھیں۔ ہنگری کے بعد سوئٹزرلینڈ تھا پھر فرانس اور اس کے بعد اسپین۔ بیچ کے یہ تین ممالک فتح

ہو جاتے تو مسلمان یورپ کے مرکز سے گذر کر مغرب (اندلس) تک جا پہنچتے ، اندلس کے سقوط کا سانحہ پیش آتا نہ یورپ کبھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلتا، اسپین کے بعد رود بار انگلستان عبور کر کے برطانیہ کی مملکت تھی جس کے شہروں میں اس زمانے میں گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، اس کو مجاہدین اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے آنے سے کوئی نہ بچا سکتا اور اسی طرح آج نہ مغرب عیسائیت کا گڑھ ہوتا نہ اسلام دشمنی کا مرکز۔ اس کے بعد بحر اوقیانوس (جسے اس زمانے میں بحر ظلمات بھی کہتے تھے کہ اس کی وسعت کے سبب کسی نے اسے پار نہ کیا تھا) کے اس طرف امریکا تھا جسے مسلمان ہی دریافت کرتے اور وہی اسے آباد کرتے۔ چنانچہ آج نہ مغربی اقوام کے مسلمانوں پر ظلم وستم کا غلبہ ہوتا نہ امریکا و اقوام متحدہ کی سازشیں۔ مگر اس موقع پر جیسے دو شیروں کے درمیان ٹکراؤ سے ایسا سانحہ پیش آ گیا جس نے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور دن بھر میں ایسا انقلاب برپا ہو گیا کہ یورپ و امریکا اور ساتھ ہی چین اور جاپان وغیرہ کی قسمت پر اسلام سے محرومی کی مہر لگ گئی۔

شیروں کاٹکراؤ

دوطوفان:

سلطان تیمور لنگ اور سلطان بایزید یلدرم اسلام کے دو شیر تھے۔ اگر یہ اپنی اپنی حدود میں بادشاہی کرتے اور دشمنانِ اسلام کے خلاف الگ الگ محاذ پر دادِ شجاعت دیتے تو اسلام اور مسلمانوں کو از حد نفع ہوتا اور روئے زمین پر مشرق سے مغرب تک اسلام کی حکمرانی ہوتی۔ مگر کفار اس امر کو بھانپ چکے تھے لہٰذا انہوں نے ایسی مکروہ سازش کھیلی کہ یہ دونوں شیر آپس میں ٹکرا گئے اور ان کے ٹکراؤ کا انجام اتنا ہولناک تھا کہ آج خطۂ ارض کے بہت سے مسلمان اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور کفار کی مسرت، شادمانی اور اطمینان دیدنی ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک طوفان تھے۔ تیمور لنگ موجودہ ہندوستان، ایران، افغانستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان، قازقستان فتح کر چکا تھا اور اب چین اور اس کے بعد بحرالکاہل کے جزیروں، جاپان، فلپائن، کوریا، تائیوان وغیرہ کی باری تھی جبکہ سلطان بایزید یورپ و ایشیا کی کئی سلطنتوں کا حکمراں تھا اور ہر گذرتے سال کے ساتھ وہ یورپ کے قلب میں آگے بڑھتا جارہا تھا۔ یورپ کے عیسائیوں سے جہاد کر کے اسے اتنا

لطف آتا تھا کہ اس نے نائکو پولس کے معرکے میں فرانس، اٹلی، آسٹریا، ہنگری اور جرمنی کی متحدہ فوجوں کو تن تنہا رسوا کن شکست دینے کے بعد ان کے گرفتار شدہ پچیس سرداروں کو رہا کر دیا اور ان کو غیرت دلائی کہ وہ گھر جا کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ اس کے مقابلے کی تیاری کریں اور اس دن کے لیے فوج جمع کر رکھیں جب وہ خود ان کے ملکوں پر حملہ آور ہوگا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اٹلی کے شہر روم کو فتح کر کے اس کے سب سے بڑے گرجا کی قربان گاہ (عیسائیوں کی ایک رسم کی جگہ) میں اپنے گھوڑے کو دانہ کھلائے۔ وہ دشمن کے منہ پر بھی اس کا اظہار کرتا تھا اور اس عزم کی تکمیل کی دُعائیں بھی مانگتا تھا۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی فطری شجاعت، اولوالعزمی اور تدبر و جنگی مہارت کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ مشکل نہ تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو نہ آج اٹلی میں ویٹی کن سٹی (کیتھولک عیسائیوں کا سب سے بڑا مذہبی مرکز) ہوتا نہ اس میں پوپ کی گدّی ہوتی جس پر بیٹھ کر وہ اگلی صدی کو عیسائیت کی صدی کہنے کا دعویٰ کرتا۔

پیدائشی فاتح:

یہ دونوں مسلمان حکمران پیدائشی فاتح تھے۔ ان کی انہی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ان کے دشمن ان کے نام سے کانپتے تھے اور ان سے ان کے مقابلے کی کوئی صورت بن نہ پڑتی تھی۔ اس زمانے میں موجودہ آذربائیجان کا علاقہ ان دونوں کی سلطنتوں کے درمیان حد فاصل تھا اور دونوں کی حدودِ مملکت کے بیچ حد فاصل کا کام دیتا تھا۔ اس کے فرمانرواؤں کی دنیا پرستی نے ان دونوں عظیم مسلمان بادشاہوں کے درمیان چپقلش کو جنم دیا اور اسلام دشمن طاقتوں کو موقع دیا کہ وہ معمولی ناراضگی کی اس چنگاری کو بڑھکا کر ایسی آگ بنا دیں جو اسلامی فتوحات کے عظیم الشان امکانات کو بھسم کر دے۔ یہ سرحدی حکام جب کبھی سلطنت عثمانیہ سے ناراض ہوتے تو تیمور سے مدد طلب کرتے اور جب کبھی تیمور ان کو سرزنش کرتا تو عثمانی سلطان کے پاس دادرسی کی فریاد لے کر پہنچ جاتے۔ اسی سلسلے میں یہاں کے دو افراد

قرایوسف ترکمان اور سلطان احمد جلائر سلطان بایزید کے پاس پہنچ کر پناہ لیے ہوئے تھے اور سلطان نے ان کو اپنے مقبوضات میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ قسطنطنیہ کا حکمران جس کا لقب قیصر ہوا کرتا تھا۔ اسے اس کی خبر ہوگئی اور اس نے تیمور لنگ کو اس کی اطلاع دے کر اسے سلطان بایزید کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی۔

پچاس سال پہلے:

یہ مکار قیصر سلطان بایزید سے شکست کھا کر اس کا باج گذار بنا ہوا تھا لیکن در پردہ اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ سلطان نے ایک مرتبہ اس کی شرارتوں اور وعدہ شکنی سے مجبور ہو کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کرلیا تھا لیکن اس نے چالاکی دکھائی اور سلطان سے وعدہ کرلیا کہ آیندہ کثیر رقم خراج میں ادا کرنے کے علاوہ قسطنطنیہ میں ایک محلّہ مسلمانوں کے لیے خاص کردے گا جہاں ان کو جامع مسجد بنانے کی بھی اجازت ہوگی اور ایک قاضی بھی مقرر ہوگا جو مسلمانوں کے تمام معاملات میں حاکم ہوگا اور مسلمان تاجروں کو بھی ہمہ قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ان شرائط پر سلطان بایزید رضامند ہوگیا اور اس نے قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھالیا ورنہ جو کارنامہ 857ھ میں سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں پورا ہوا وہ پچاس سال قبل سلطان بایزید کے ہاتھوں پورا ہوجاتا۔ سلطان سے صلح کرلینے کے باوجود قیصر یورپی سلطنتوں کو سلطان کے خلاف اُبھارنے اور عثمانی مقبوضات پر حملہ آور ہونے بلکہ سلطنت عثمانیہ کو ختم کردینے کے لیے ورغلاتا رہتا تھا۔ چنانچہ جب سلطان قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھا کر اپنی ایشیائی سلطنت میں آگیا تو یورپ میں اس کے خلاف سازش پنپنے لگی۔

یورپیوں کی فریاد:

ہوا یوں کہ 795ھ میں سلطان نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریہ کی مہم پر روانہ کیا۔ سلیمان پاشا نے تین ہفتوں کے محاصرے کے بعد بلغاریہ فتح کرلیا۔ یہاں کا

شاہی خاندان ختم ہوگیا اور سارا ملک سلطنت عثمانیہ میں داخل ہوگیا۔ بلغاریہ کی سرحدیں ہنگری سے ملتی تھیں۔ ہنگری کو خطرہ لاحق ہوا تو اس نے اپنے تحفظ کے لیے یورپ کی تمام طاقتوں سے فریاد کی۔ (اس جملے کو ذرا پھر سے پڑھیے۔ ایک مسلمان فرمانروا کے مقابلے کے لیے شیرِ دل یورپی اپنے سب بھائی بندوں کو رہائی دے رہے تھے) روم کے پوپ نے بھی اس کی تائید کی اور صلیبی جنگ کا اعلان کردیا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے خلاف ایک عظیم الشان صلیبی لشکر وجود میں آ گیا۔ سلطان بایزید کے والد سلطان مراد کے عہد میں بھی یورپی طاقتوں نے اتحاد کیا تھا اور کوسوو کے میدان میں شکست کھائی تھی، مگر اب کی مرتبہ یورپ کی تقریباً تمام ہی طاقتیں مسلمانوں کے خلاف جمع ہوگئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کے دو بڑے مذہبی مراکز روم و یونان کے کلیسا نے اتحاد کرلیا تھا۔ اور روم کے پوپ (جس کے بارے میں سلطان بایزید کہتا تھا کہ اس کے گرجا میں اپنے گھوڑے کو دانہ کھلاؤں گا) نے اعلان کیا کہ جو عیسائی آسٹریا یا ہنگری پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوگا وہ گناہوں سے بالکل پاک ہوجائے گا۔ اِدھر فرانس اور انگلستان میں جنگ چھڑی ہوئی تھی، مگر یورپ کے بااثر حکمرانوں نے دونوں کے درمیان جنگ بندی کرواکر انہیں مسلمانوں کے مقابلے میں لا اُتارا۔ اس طرح پہلی مرتبہ مغربی یورپ بھی مسلمانوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اُتر آیا۔

غرور کی انتہا:

ہنگری میں جمع ہونے والی ان اتحادی افواج کی تعداد ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ ہر ملک نے اپنے مانے ہوئے تجربہ کار سپہ سالار اور چنے ہوئے آزمودہ کار فوجی بھیجے تھے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ لشکر اس اعتبار سے منفرد تھا کہ اس کے تمام سپاہی اور سپہ سالار دنیا کے بہترین اور منتخب جنگجو تھے۔ خود عیسائیوں کو بھی اس بات کا

احساس تھا۔ چنانچہ وہ نہ صرف تھے ہنگری کی مدد کرنا چاہتے تھے بلکہ ان صلیبیوں کے منصوبے تھے کہ ہنگری میں مسلمانوں کی قوت توڑ دینے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور شام میں داخل ہو کر ارضِ مقدس پر قبضہ کر کے سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں پہنچنے والی شکست کا انتقام بھی لیں۔ اس لشکر کے کمانڈروں کو اپنی کثرت، قوت اور تجربے پر اتنا گھمنڈ آ گیا تھا کہ وہ برملا کہا کرتے تھے کہ اگر آسمان بھی ہم پر ٹوٹ پڑا تو (نعوذ باللہ) ہم اسے اپنے تیروں کی نوک پر روک لیں گے۔ الغرض یورپ کے مشرق سے اٹلی، آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، جرمنی اور مغرب سے فرانس اور انگلینڈ کی مایہ ناز متحدہ فوجوں پر مشتمل یہ ٹڈی دَل نما لشکر ہنگری کے بادشاہ سجسمنڈ کی قیادت میں سلطان بایزید پر حملے کے لیے بڑھا۔ قسطنطنیہ کا قیصر چونکہ ہر وقت سلطان کی ٹھوکروں میں رہتا تھا، اس لیے اعلانیہ ان کے ساتھ شریک نہ ہوا، مگر خفیہ طور پر اور معنوی حیثیت سے وہی اس جنگی تیاری کا باعث اور محرک اوّل تھا۔

گرجتا طوفان:

صلیبی عیسائیوں کا یہ سیلاب جب خطرناک ارادے لے کر روانہ ہوا تو سلطان بایزید اپنی وسیع سلطنت کے ایشیائی علاقے میں تھا۔ صلیبی جنگجو راستے میں لوٹ مار کرتے ہوئے چلے۔ جو بھی مسلمان ملتا اسے تہ تیغ کرتے جاتے تھے۔ فرانس سے آئے ہوئے مددگاروں نے چونکہ سلطان کی شہرت بہت سنی تھی، اسے دیکھا نہ تھا، نہ کبھی مسلمانوں سے دو ہاتھ کیے تھے اس لیے وہ نسبتاً زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سلطان اپنے دارالسلطنت سے بہت دور تھا۔ اگر صلیبیوں کا لشکر اسی رفتار سے چلتا رہتا تو عین ممکن تھا کہ سلطان کے اپنے دارالسلطنت واپس پہنچنے سے قبل یہ وہاں بھی پہنچ جاتے اور سلطان کو سخت پریشانی اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا، مگر اس موقع پر ایک ترک کمانڈر نے سچے اور جوانمرد مجاہد

ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے تن تنہا اس اتحادی لشکر کی طوفانی یلغار کو روکے رکھا۔ چنانچہ جب صلیبی لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے ہوئے اس کے شہر نائکوپولس کے سامنے پہنچے تو یوغلان بے نامی اس کمانڈر نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور محاصرہ کی انتہائی شدت کے باوجود حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ سلطان کے لیے اتنا موقع کافی تھا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح یورپ آ پہنچا۔ مسیحی لشکر فتوحات کے نشے میں غرق تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سلطان اتنی جلد ان کے سروں پر آ پہنچے گا۔ اپنی کثرت سے مغرور ہو کر وہ برملا کہتے تھے کہ سلطان ہماری کثرت و قوت کا حال سن کر یورپ کے ساحل پر اُترنے کی جرأت بھی نہ کر سکے گا لیکن سلطان بجلی کی سی سرعت سے نائکوپولس کے محاصرے کے دوران ہی گرجتے طوفان کی طرح آ پہنچا۔ اس کی آمد کی اطلاع پا کر عیسائی افواج میں کھلبلی مچ گئی۔

گھمسان کا رن:

یہ 23 ذی قعدہ 798ھ/ 24 ستمبر 1396ء کا دن تھا جب یورپ کی سرزمین پر مسلمانوں اور صلیبی افواج کے درمیان گھمسان کا رن پڑا۔ فرانسیسی کمانڈروں کو سلطان سے مقابلہ کا شوق تھا اس لیے وہ آگے آگے تھے، مگر جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ معرکہ نائکوپولس کے نام سے مشہور یہ جنگ جسے عثمانی دور کی مشہور جنگ کہا جاتا ہے، تین گھنٹے کے مختصر وقت میں مسلمانوں کے حق میں ختم ہو گئی۔ صلیبی اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی۔ ان کے ہزاروں سپاہی کام آئے اور ان کے خون سے میدان جنگ لالہ زار بن گیا۔ دس ہزار کے قریب گرفتار ہوئے جن میں پچیس بڑے کمانڈر اور شہزادے بھی تھے۔ شاہ ہنگری بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ اس عظیم الشان فتح کی خبر اسلامی ممالک میں پہنچی تو ہر جگہ مسرت اور خوشی سے شکرانہ ادا کیا گیا۔ فتح کے بعد سلطان ان عیسائی سرداروں اور

ریاستوں کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے غداری کی تھی۔ چنانچہ اس نے یونان، سسلی وغیرہ پر حملہ کر کے انہیں فتح کرلیا۔ قسطنطنیہ کے قیصر نے بھی چونکہ درپردہ غداری کی تھی اس لیے سلطان نے اسے بھی فتح کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت بہادری اور مہمات سر کرنے کے شوق کو دیکھ کر قطعاً مشکل نہ تھا کہ قسطنطنیہ فتح نہ ہوتا، مگر اس موقع پر وہ سانحہ پیش آ گیا جو اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔

حسرتوں کا مدفن

قیصر کی چال:

معرکہ نائکو پولس میں قسطنطنیہ کے قیصر (رومی حکمرانوں کا شاہانہ لقب) نے عیسائی اتحادیوں سے جو باہمی گٹھ جوڑ کیا تھا اور جس طرح کی ریشہ دوانیاں کی تھیں، اس کا انجام اب اسے قریب نظر آ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عثمانی سلطان غداری کو کبھی معاف نہ کرے گا اور پچھلی مرتبہ کی طرح خراج وغیرہ دے کر بھی وہ اپنی جان نہ بچا سکے گا، لہٰذا اپنی مجبوری اور ذلت کو دیکھ کر اس نے ایک خطرناک چال چلی۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے ہم مذہب یورپی عیسائیوں میں سے کوئی سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لہٰذا اس مرتبہ اس کی کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح سلطان تیمور لنگ کو برانگیختہ کر کے سلطان بایزید یلدرم کے مقابلے پر لا کھڑا کرے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان جذبہ رقابت بڑھانے کے لیے اس نے انتہائی چاپلوسی اور مکاری سے کام لیتے ہوئے تیمور کو ایک خط لکھا۔ یہ خط مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کی روایت کے مطابق کچھ یوں تھا:

’’میری سلطنت بہت پرانی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین

کے زمانے میں بھی قسطنطنیہ کے اندر ہماری سلطنت موجود تھی۔ اس کے بعد بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانے میں بھی خلفاء سے بارہا ہماری صلح ہوئی اور کسی نے قسطنطنیہ کے لینے کا قصد نہیں فرمایا، لیکن اب عثمانی سلطان نے ہمارے اکثر مقبوضات چھین لیے ہیں اور ہمارے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر اُس کا دانت ہے۔ ایسی حالت میں سخت مجبور ہوکر ہم آپ سے امداد کے خواہاں ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کے سوا ہم اور کسی سے امداد مانگ بھی نہیں سکتے۔ آپ کو اگر بایزید خان یلدرم کے مسلمان اور ہمارے عیسائی ہونے کا خیال ہو تو آپ کو واضح رہے کہ بایزید خان کو اس طرح یورپ میں مسلسل فتوحات حاصل ہو رہی ہیں اُس کی طاقت بڑی تیز رفتاری سے ترقی پذیر ہے۔ وہ بہت جلد اس طرف سے مطمئن اور فارغ ہوکر آپ کے مقبوضہ ممالک پر حملہ آور ہوگا اور اُس وقت آپ کو اُس کے زیر کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوگا۔ بایزید خان نے سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان کو جو آپ کے مفرور باغی ہیں، اپنے یہاں عزت کے ساتھ مہمان رکھ چھوڑا ہے اور یہ دونوں باغی اُس کو آپ کے خلاف جنگ کرنے اور مشورہ دینے میں برابر مصروف ہیں۔ یہ بات بھی آپ کے لیے کچھ کم بے عزتی کی نہیں ہے کہ آپ کے باغی سلطان بایزید خان کے پاس اس طرح عزت و اکرام کے ساتھ رہیں اور آپ اُن کو واپس طلب نہ کرسکیں۔ پس مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایشیائے کوچک پر حملہ کریں، کیونکہ اس ملک کو قدرتی طور پر آپ کے قبضے میں رہنا چاہیے اور بایزید خان یلدرم کے فتنے سے ہم کو بچائیں۔ ہم سے جو کچھ ممکن ہوگا آپ کی امداد کریں گے۔'' (تاریخ اسلام: 1357، 1358)

جذبۂ رقابت:

تیمور اس وقت ہندوستان کی فتح سے تازہ تازہ فارغ ہوا تھا۔ اس کا لشکر ملتان اور دہلی سے ہوتا ہوا دریائے گنگا کے کنارے پہنچ چکا تھا اور اب وہ ہندوستان کے مشرقی صوبوں

کی طرف بڑھنے کا قصد کر رہا تھا۔ ہندوستان کی فتح کی تکمیل کے بعد اس کی ترکتازیوں کا رُخ چین کی طرف ہوتا، لیکن قیصر روم کی سازش اپنا کام دکھا چکی تھی۔ تیمور اگرچہ سمجھتا تھا کہ عیسائی فرمانروا اس کو استعمال کر کے اپنی سلطنت کا تحفظ اور ذاتی اغراض کی تکمیل چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے بغیر کچھ کہے قاصد کو واپس کر دیا، مگر اس خط میں کچھ اس انداز سے باغیوں کی پناہ دہی اور تیمور کے مقبوضات پر حملے کے خطرے کو بیان کیا گیا تھا کہ یہ باتیں اسے رہ رہ کر ستاتی تھیں، حتیٰ کہ اس کا دل ہندوستان سے اُچاٹ ہو گیا اور وہ اس نومفتوحہ ملک کو بغیر کسی معقول انتظام کے چھوڑ کر اپنے پایۂ تخت سمرقند کو واپس روانہ ہوا۔ اس کی زندگی کا یہ نازک مرحلہ تھا۔ اگر اس وقت وہ اپنے جذبہ رقابت پر قابو پالیتا اور سلطان بایزید کو یورپ کے عیسائیوں سے جہاد کے لیے آزاد چھوڑ دیتا تو یہ اس کے اور تمام مسلمانوں کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ کسوو اور نائکوپولس کے معرکوں نے عیسائیت کے تن سے جان نکال لی تھی اور سلطان بایزید کی اٹلی کو فتح کر کے اس کے مرکزی گرجا میں اپنے گھوڑے کو دانہ کھلانے کی دیرینہ تمنا کی تکمیل کا وقت قریب آ گیا تھا اور اگر وہ قسطنطنیہ فتح کر کے یورپ کے اندر بڑھتا چلا جاتا تو نہ اندلس مسلمانوں کے ہاتھ سے جاتا اور نہ انگریزوں جیسی موذی قوم چند صدیوں بعد عالمِ اسلام کے امن وسکون کو تہ و بالا کرنے کے لیے جزائر برطانیہ سے باہر نکلتی، لیکن افسوس کہ تیمور نے دنیا کو تو فتح کر لیا، مگر اپنے نفس پر قابو نہ پا سکا۔

نفس کے پھندے:

اس سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ وہ قیصر کو ایسا مایوس کن جواب دیتا جیسا ساڑھے سات سو سال پہلے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قیصر روم کے اسی طرح کے خط کے جواب میں دیا تھا۔ اس وقت کے قیصر نے بھی اس طرح کی چال چلنے کی کوشش کی تھی، مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ جلیل القدر صحابی تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و

تربیت کی برکت سے نفس کی آلائشوں سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے، اس لیے آپ قیصر کے ورغلانے میں نہ آئے، بلکہ اسے وہ جواب دیا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تزکیہ نفوس پر شاہد عدل اور مسلمانوں کے لیے باہمی اختلافات کے موقع پر بہترین راہنما ہے۔ آپ نے قیصر کو لکھا: ''اگر تیرے مقابلے کے لیے علی (رضی اللہ عنہ) کے لشکر کو پیش قدمی کرنی پڑی تو اس کے لشکر سے سب سے پہلے جو سردار تجھ پر حملہ آور ہوگا۔ وہ معاویہ (رضی اللہ عنہ) ہوگا۔'' مگر تیمور کو علماء ومشائخ کی صحبت نصیب نہ تھی جو اسے انسان کے باطن کی آلودگیوں اور ان کے نقصانات سے آگاہ کرتے اور اس بات پر آمادہ کرتے کہ وہ اپنے نفس کے سفلی تقاضوں پر صبر کرے، جذبۂ غضب و رقابت پر قابو پائے اور اسلام اور مسلمانوں کے فائدے کی خاطر عثمانی سلطان کا اگر کوئی قصور ہے بھی تو اس سے صرف نظر کرے، مگر افسوس کہ وہ یہ سعادت مندانہ فیصلہ نہ کر سکا، بلکہ اپنے نفس کے پھندوں میں گرفتار ہو کر اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ سلطان بایزید سے دو دو ہاتھ کر کے اس بات کا فیصلہ کر لیا جائے کہ ہم دونوں میں سے کس کو دنیا کا فاتح بننا چاہیے۔

بلقان کا شیر:

ادھر سلطان بایزید یلدرم اس کے تمام ارادوں سے بے خبر ہنگری و آسٹریا (وسطی یورپ کے دو مشہور ملک) کی فتوحات کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا تا کہ یہاں سے جلد فارغ ہو کر اٹلی کی طرف متوجہ ہو اور پاپائے روم کی مزاج پرسی کرے۔ اسے ہرگز یہ خطرہ نہ تھا کہ تیمور لنگ قیصر کا حمایتی بن کر اس سے لڑنے آئے گا اور نہ ہی اسے تیمور کا کچھ خوف تھا کیونکہ اپنی فطری شجاعت کے سبب وہ تیمور کی فتوحات اور اس کے رعب و دبدبے کا غلغلہ سن کر بھی اسے خاطر میں لاتا تھا نہ اس سے مرعوب ہوتا تھا۔ تیمور کو سلطان بایزید کی اس حد سے بڑھی ہوئی دلیری اور اعلیٰ جنگی قابلیت کا احساس تھا اور اچھی طرح جانتا

تھا کہ پوری تیاری کے بغیر اس کے سامنے گیا تو نا قابل شکست رہنے کا اعزاز اس سے چھن جائے گا اور وہ بلقان کے اس شیر کے ہاتھوں اپنا رعب و دبدبہ اور عزت و سلطنت گنوا بیٹھے گا، لہٰذا اس نے کسی قسم کی عجلت کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ بڑی احتیاط کے ساتھ تیاریوں میں مصروف رہا اور اس طرح مسلمان کی قوت مسلمان ہی کے خلاف استعمال کرنے کی ناپاک عیسائی سازش زیرِ زمین پنپنے لگی۔ سلطان بایزید کو جاسوسوں کے ذریعے اس کے ارادوں کی خبر پہنچتی تو اس نے احتیاطاً اپنے ایک بیٹے ارطغرل کو دونوں سلطنتوں کی سرحد پر واقع سیواس نامی شہر بھیج دیا تا کہ اگر تیمور اس طرف کو بڑھے تو اسے روکے۔

حالات کا جبر:

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ تمام دیگر عثمانی سلاطین کی طرح بایزید یلدرم بھی مسلمان بادشاہوں سے لڑنا کسی طرح درست نہ سمجھتا تھا، اس کی ایک ہی تمنا تھی کہ یورپی عیسائی جو متحد ہو ہو کر اسلامی مملکت پر حملہ آور ہوتے تھے۔ کسی طرح ان کا زور توڑ کر اسلامی فتوحات کا سلسلہ سارے یورپ تک وسیع کرے۔ ظاہری اسباب کے لحاظ سے اور اس کے لشکر میں شامل مجاہدین کے تقویٰ اور شجاعت کو دیکھتے ہوئے وہ اس کا پوری طرح اہل بھی تھا، مگر قسمت کا لکھا کہیے یا کچھ اور کہ کسی کلمہ گو پر تلوار نہ اُٹھانے کے قوی عزم کے باوجود حالات ایسے ہوتے چلے گئے کہ قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھا کر تیمور کے مدمقابل آنے پر مجبور ہو گیا۔ تیمور نے تمام تیاریاں کر لینے کے بعد اسے خط لکھا کہ ہمارے باغی سرداروں کو ہمارے حوالے کرو۔ سلطان اپنی غیرت کے خلاف یہ مطالبہ کس طرح منظور کر سکتا تھا؟ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اگر چہ سرداروں کا معاملہ کچھ ایسا اہم نہ تھا کہ یہ دونوں عظیم مسلمان فاتح آپس میں ٹکرا جاتے، مگر قیصر روم کی لگائی ہوئی آگ اپنا کام دکھا چکی تھی۔ تیمور نے نہ دیکھا کہ بایزید کتنی بڑی مہم کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہے اور اس موقع پر اس کی توجہ

ہٹانا یا اس کی طاقت کو کمزور کرنا مسلمانوں کے لیے زبردست نقصان کا باعث ہوسکتا ہے۔ خود اس نے اپنی ہیبت ناک طاقت وسلطنت کے باوجود کافرممالک پر حملوں کی بجائے مسلمان علاقوں پر ہی یورش کی تھی۔ لہٰذا اس سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچ رہا تھا، جبکہ بایزید کی تمام معرکہ آرائیاں اب تک اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے خلاف تھیں، وہ مسلمان حکمرانوں سے مخالفت مول لینے سے حتی الامکان بچتا چلا آرہا تھا، مگر افسوس کہ تیمور نے اسلام کے لیے اس کی خدمات اور مسلمانوں کو اس سے پہنچنے والے نفع کی پروانہ کی اور خط کا جواب انکار میں ملنے پر آگے بڑھ کر سیواس شہر کا محاصرہ کرلیا اور سلطان بایزید کے بیٹے ارطغرل کو چار ہزار سپاہیوں سمیت شہید کر دیا۔

حسرتوں کا مدفن:

سلطان بایزید جس نے اپنی آنکھوں میں فتح یورپ کے خواب سجائے ہوئے تھے نے مجبور ہوکر قسطنطنیہ کا محاصرہ اُٹھالیا اور سیواس کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی جبکہ تیمور کے لشکر کی تعداد پانچ لاکھ یقینی تھی اور بعض مؤرخین سات سے آٹھ لاکھ تک بھی بتاتے ہیں۔ سیواس کا میدان اتنی بڑی فوجوں کے لیے تنگ تھا، اس لیے بایزید کے آنے کی خبر سن کر تیمور لنگ انگورہ نامی مقام کی طرف بڑھا اور اس جگہ مسلمانوں کی دو عظیم طاقتیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوگئیں۔ (دیکھیے نقشے میں عبرتناک جگہ) دونوں طرف اسلامی دنیا کے منتخب، تجربہ کار اور بہادر جنگجو تھے، جس طرح مشرق میں تیمور کا کوئی مقابل نہ تھا، اس طرح مغرب میں کوئی طاقت بایزید کا سامنا کرنے کے قابل نہ تھی۔ اگر یہ آپس میں اُلجھنے کی بجائے کفار سے مقابلے میں اپنی طاقت صرف کرتے تو بلاشبہ دونوں میں اتنی صلاحیت تھی کہ مشرق سے مغرب تک کو اسلام کی جھولی میں لا ڈالتے، مگر افسوس کہ یہ ساری حسرتیں انگورہ کے میدان میں دفن ہوگئیں۔ تیمور کی افواج سلطان

بایزید کے لشکر سے کئی گنا زیادہ تھی مگر سلطان بایزید اور اس کی فوج کی بہادری بھی شہرۂ آفاق تھی، انہوں نے جنگ سے منہ نہ موڑا لہٰذا دنیا کے دو عظیم فاتح اور بلند مرتبہ بہادر انگورہ کے میدان میں ایک دوسرے سے ٹکرانے چلے یا یوں کہیے کہ دو سمندر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے جوش میں آ کر ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور ایک ہیبت ناک جنگ وقوع پذیر ہوئی۔

اُمیدوں کی پامالی:

19 ذی الحجہ 804ء مطابق 20 جولائی 1402ء کو یہ دونوں غضبناک شیر آپس میں ٹکرائے۔ اس زور کی معرکہ آرائی تھی کہ چشم فلک نے خال خال ہی دیکھی ہوگی۔ تیمور کی فوج تعداد میں کئی گنا زیادہ اور تازہ دم تھی، مگر عثمانی افواج نے انہیں کسی طرح بھی مناسب جواب نہ ملنے کا شکوہ نہ ہونے دیا۔ اس روز بایزید نے سپہ سالاری کے جوہر دکھانے کے ساتھ ایک بہادر سپاہی کی طرف بذات خود صف شکن حملے کیے، اس کی بہادر فوج نے بھی اس کی تقلید میں مردانگی کا خوب خوب حق ادا کیا اور کئی مرتبہ تیموری دستوں کو الٹ ڈالا۔ مگر عین اس وقت جب جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی تھی، عثمانی افواج کو یہ صدمہ پہنچا کہ اس کی فوج میں سے تاتاریوں کے کچھ دستے غداری کر کے تیمور کے ساتھ جا ملے، بایزید کے کئی جانثار مارے گئے تھے اور اس کے ساتھ اس کی خصوصی فوج کے مختصر دستے رہ گئے تھے، مگر اس مختصر فوج نے بھی اس روز جس حیرت انگیز شجاعت کا ثبوت دیا، س کی مثال خود عثمانی افواج میں بھی کم ہی پائی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ تو سلطان بایزید دشمن کی صفیں چیر کر اس مقام تک پہنچ گیا جہاں تیمور کھڑا اپنی افواج کو لڑا رہا تھا، مگر عثمانی افواج تھکن، غداری اور قلت تعداد کے سبب چور ہو چکی تھیں، لہٰذا مغرب کے وقت جب کہ بایزید کے قریبی تمام ساتھی مارے جا چکے تھے، اس عثمانی شیر کو بعض روایات کے مطابق کمندیں ڈال کر اور بعض

روایات کے مطابق گھوڑے کے ٹھوکر کھا کر گر جانے سے گرفتار کرلیا گیا اور اس طرح اندھیرا ہوتے ہوتے میدان انگورہ میں اسلامی دنیا کی وہ تمام امیدیں دم توڑ گئیں جو سلطان بایزید کی ذات سے وابستہ تھیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

سینے کا داغ:

سلطان بایزید کا انگورہ کے میدان میں گرفتار ہوجانا ایسا واقعہ ہے جس کے تصور سے بے اختیار قلب پر حسرت وغم کا ہجوم چھا جاتا ہے۔ اگر اس جنگ میں تیمور کو شکست ہوتی تو تیمور کو تو نقصان پہنچتا، لیکن عالمِ اسلام کو اس کی شکست سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ تھا کیونکہ جو مشرقی ممالک تیمور کے قبضے میں تھے ان کے بارے میں ہرگز یہ خطرہ نہ تھا کہ یہ ممالک کسی غیر مذہب کی حکومت میں شامل ہوجائیں گے، مگر بایزید کی شکست سے عالمِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا۔ یورپ کی طرف اسلام کی پیش قدمی رک گئی۔ نیم مردہ عیسائی پھر سے سکون و اطمینان کا سانس لینے لگے، بلکہ انہوں نے طاقتور ہوکر اندلس مسلمانوں سے چھین لیا۔ اس طرح یورپ جو اسلامی براعظم بننے کے قریب ہوگیا تھا۔ عیسائی براعظم رہ گیا جہاں آج کل بچے کھچے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے اور یہ سب کچھ ایک مسلمان کے ہاتھوں معمولی بات پر دوسرے مسلمان کو پہنچائے جانے والے نقصان کے سبب ہوا۔ آہ افسوس!

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

پتھر کے آنسو:

سلطان بایزید جیسا فطری بہادر شخص قید کی زندگی برداشت نہ کرسکتا تھا لہٰذا وہ اس کیفیت کو زیادہ عرصہ سہہ نہ سکا اور صرف آٹھ مہینے بعد ہی اس کی عقابی روح اس کے شیر جیسے جسم سے پرواز کرگئی۔ اس جلیل القدر سلطان کی یہ عبرت انگیز موت ایسا دردناک واقعہ

تھی کہ مؤرخین کی تصریح کے مطابق تیمور جیسے شقی القلب انسان کے بھی آنسو نکل آئے۔ اس نے بایزید کے بیٹے موسیٰ کو جو خود بھی قید میں تھا۔ آزاد کر کے اجازت دی کہ اپنے والد کی لاش لے جا کر عثمانی سلاطین کے پہلو میں دفن کرے۔ جنگ انگورہ کا ذکر تیمور نے اپنی توزک (یادداشتوں) میں کیا ہے مگر نہایت مجمل و مختصر، حالانکہ یہ اس کی زندگی کی وہ جنگ تھی جس میں صحیح معنوں میں اسے مضبوط مدمقابل ملا تھا۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسے بایزید کی وفات پر اپنی اس حرکت پر سخت افسوس ہوا کہ اس نے عثمانی سلطان اور اس کے لشکر کو کیوں تباہ کیا؟ یہی وجہ ہے کہ اس نے دوسری جنگوں کے برعکس اس فتح پر فخر و خوشی کے جملے استعمال نہیں کیے۔ انہی یادداشتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے تمام مسلمانوں نے اس کی اس فتح کو نہایت نفرت اور رنج کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ بایزید کے فوت ہونے کے بعد تیمور بھی زیادہ دنوں نہیں جیا۔ وہ سمرقند پہنچ کر چین پر چڑھائی کے ارادے سے روانہ ہوا (شاید اپنے جرم کی تلافی کرنا چاہتا ہو، کیونکہ یہ پہلی چڑھائی تھی جو وہ کسی غیر مسلم ملک پر کر رہا تھا، اس سے قبل اس کی ساری زندگی مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگتے گزری تھی۔) اس وقت چین ہی ایسی طاقت جو اس کی ترکتازیوں کی جولان گاہ بن سکتی تھی، مگر راستے میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ دشمن کی سازش سے ان دو عظیم اور غیر معمولی فاتح حکمرانوں کے درمیان رقابت کی جو آگ بڑھکی تھی اس نے مسلمانوں کی فتوحات اور ترقی کے امکانات کو اپنے شعلوں میں لپیٹ کر بھسم کر دیا اور اس طرح باہمی اختلافات سے وہ نقصان ہوا جس کا خمیازہ آج یورپ کی کئی ریاستیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ خدا جانے آیندہ کب کوئی ایسا فاتح پیدا ہوگا جو دونوں کی نامکمل چھوڑی ہوئی مہموں کی تکمیل کر کے پورے کرۂ ارض کو اسلام کی روشنی سے منور کرے گا؟؟؟

باسفورس کے کنارے

اس مضمون کا آغاز تاریخ کے اس دوسرے لمحے کے ذکر سے ہونا چاہیے جس میں شامتِ اعمال نے مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا.......... لیکن اس لمحے کے ذکر سے قبل برسبیلِ تذکرہ سلطنتِ عثمانیہ کے اس سپوت کا ذکر کرتے چلیں جس نے ایسا عدیم المثال کارنامہ انجام دیا جسے دیکھنے، سننے والے آج بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

نامور سالار کا نامور پوتا:

امیر تیمور کا سلطان بایزید یلدرم سے ایسے نازک وقت میں الجھنا جبکہ وہ قسطنطنیہ کا کامیاب محاصرہ کر چکا تھا اور توقع تھی کہ وہ قسطنطنیہ فتح کرنے کے 800 سالہ قدیم اسلامی خواب کو خوبصورت تعبیر دے کر آئندہ چند برسوں میں یورپ کے دیگر اہم ممالک خصوصاً اٹلی کو فتح کرلے گا.......... مسلمانوں کے لیے نہایت نقصان دہ اور تباہ کن ثابت ہوا۔ یورپ اس لمحے عثمانی فوج کے نہ سنبھلنے والی یلغار کے خوف سے تھر ا رہا تھا اور بڑی بڑی یورپی سلطنتیں جو آج مسلمانوں کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہیں، دم سادھے سہمی ہوئی اپنے انجام کے دن گن رہی تھیں لیکن انگورہ کی جنگ نے ان سب کو محفوظ و مطمئن کر دیا اور یورپی

سور ماؤں کو خاطر میں نہ لانے والے مسلمان اپنے نفس کے آگے شکست کھا جانے کے سبب انگلش چینل کو عبور کرنے کی بجائے آج تک آبنائے باسفورس کے کنارے پناہ گزین ہیں۔ امیر تیمور کے ہاتھوں سلطان بایزید کی گرفتاری کے بعد بظاہر سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا تھا، قیصر اپنی سازش کی کامیابی پر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور یورپ کا خیال تھا کہ ان کا دشمن ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا ہے لیکن سلطان بایزید کے بیٹے سلطان محمد اول نے حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف سلطنتِ عثمانیہ کی از سرِ نو تعمیر و استحکام کا فریضہ سرانجام دیا اور یورپ کو یقین دلا دیا کہ وہ اسلام کے تحفظ کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ 11 سال کے قلیل عرصے میں سلطنت کو سیاسی، عسکری اور معاشی اعتبار سے اتنا مضبوط کر دیا کہ مؤرخین نے اتنی جلد تباہ شدہ سلطنت کے ملبے سے عظیم بادشاہت کی نمود کو عدیم النظر واقعہ قرار دیتے ہوئے اس سلطان کو دولتِ عثمانیہ کے لیے ''نوح'' کا لقب دیا ہے۔ اسی باہمت سلطان کی نسل سے اس کے پوتے سلطان محمد ثانی نے جنم لیا جس کے شاندار کارناموں کے تذکرے کے لیے ہم اس مجلس کے اصل موضوع سے انحراف کو گوارا کر رہے ہیں۔

صدیوں پرانی خواہش:

سلطان محمد ثانی آلِ عثمان کا وہ نامور، اولوالعزم اور مجاہد حکمران گزرا ہے جو رہتی دنیا تک فاتح قسطنطنیہ کے لقب کے ساتھ آسمان شہرت پر جگمگاتا رہے گا۔ سلطان محمد فاتح قرونِ وسطیٰ کے باہمت مسلمان نوجوانوں میں سے وہ گوہرِ آبدار تھا جس کی نظیر اس کا معاصر یورپ پورے ایک ہزار سال میں پیش نہیں کر سکا۔ وہ جب 21 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تو قیصر قسطنطنیہ نے (جس کا نام پیلیولوگس PalaeoLogus تھا) اپنی آبائی عادت کے مطابق نوعمر سلطان سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور اس کے مقابلے میں تخت کا ایک اور دعویدار کھڑا کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے کی دھمکی دی۔ سلطان محمد کو وہ ایک ناتجربہ

کارحکمران سمجھتا تھا لیکن جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی اس مجنونانہ اور احمقانہ حرکت نے باہمت نوجوان سلطان کو موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ موجودہ قیصر سے اپنے دادا کا انتقام لینے کے ساتھ اپنے آباء واجداد کی وہ خواہش پوری کر دکھائے جو صدیوں سے ان کے دلوں میں ہلکورے لیتی تھی۔

قسطنطنیہ کے دو تحفے:

شہر قسطنطنیہ مشرق و مغرب کے سنگم پر واقع وہ مستحکم و مضبوط اور بظاہر نا قابلِ تسخیر قلعہ بند شہر تھا جس کے فتح کی بشارت اور فاتحین کی فضیلت پیغمبر آخر الزماں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے بیان فرمائی تھی اور اس فضیلت کے حصول کے لیے مسلمان اب تک 12 مرتبہ اس شہر کا محاصرہ کر چکے تھے۔ قسطنطنیہ درحقیقت ایشیا و یورپ کی حدِ فاصل پر واقع وہ ہیرا تھا جس کی کرنیں حوصلہ مند فاتحین کی آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھیں۔ یہ شہر اپنے بہترین جغرافیائی محل وقوع، معتدل آب و ہوا، محفوظ اور وسیع بندرگاہ، کشادہ بازاروں، صاف شفاف سڑکوں، بلند و بالا عمارتوں، عظیم الشان اور شاندار درس گاہوں کی وجہ سے دنیا بھر میں ثقافتی، تہذیبی، علمی، مذہبی اور تجارتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ بازنطینی سلطنت کا یہ دارالحکومت اپنے مضبوط قلعوں اور قدرتی حصار کے سبب حملہ آوروں کے مقابلے میں صدیوں سے چٹان کی طرح جما ہوا تھا۔ 658 قبل مسیح جو اس کا سن تعمیر ہے، سے لے کر سلطان محمد فاتح کے زمانے تک مسلمانوں کے 12 محاصروں کو ملا کر 29 مرتبہ اس کا محاصرہ ہو چکا تھا جس میں سے 8 بہت زبردست اور کامیاب تھے.......... لیکن اس شہر کی مضبوط دیواریں اب تک نا قابلِ تسخیر ثابت ہوئی تھیں۔ سلطان بایزید یلدرم کی جنگی صلاحیت کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ اسے فتح کر لے گا لیکن قدرت نے یہ سعادت اس کے پوتے کے نصیب میں لکھی تھی جو عزم و ہمت اور حوصلہ و تدبیر میں ایک مثالی نوجوان مجاہد کا

شاہکار نمونہ تھا۔آ گے چلنے سے پہلے یہ بات جاننے کے قابل ہے کہ قسطنطنیہ ہی وہ شہر ہے جس نے دنیا کو دو چیزوں سے متعارف کروایا: رومی قانون اور یونانی فلسفہ۔رومی قانون کی دھجیاں تو تاریخ کے تھپیڑوں نے بکھیر کر رکھ دیں لیکن یونانی فلسفہ وہ وبال ہے جو آج تک مسلمان اہلِ علم کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے اور حکمت کے نام سے مدارس میں پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔

سچی پیش گوئیاں:

حدیث کی دیگر کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری شریف میں وہ احادیث موجود ہیں جن میں قسطنطنیہ پر حملہ آور ہونے والے مسلم مجاہدین کی مغفرت کی بشارت کے ساتھ یہ اشارہ ہے کہ اس پہلے حملے میں فتح نہ ہوگی کیونکہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فاتحین کی بجائے غازیوں کا ذکر فرمایا ہے: ''اوّل جیش من أمتی یغزون مدینة قیصر مغفور لھم.'' (میری امت میں سے جو لشکر سب سے پہلے قسطنطنیہ پر جہاد کرے گا وہ بخشا بخشایا ہے) البتہ دوسری حدیث میں ''لتفتحن القسطنطنیة، ولنعم الجیش تلک الجیش، ولنعم الأمیر أمیرھا.'' (تم لوگ ضرور قسطنطنیہ فتح کرو گے۔پس فاتح لشکر اور اس کا امیر کیا ہی اچھے لوگ ہوں گے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے فتح کی بشارت دی ہے اور فاتح مجاہدین اور ان کے امیر کی تعریف فرمائی ہے۔سلطان محمد ثانی ارادوں کا اس قدر بلند اور عزم کا اس قدر پختہ مسلمان تھا کہ اس کے سیرت نگاروں نے فتح قسطنطنیہ کو اس کے بچپن کا خواب بتایا ہے۔یعنی آج جس عمر میں ہماری قوم کے بچے مم اور ڈیڈ سے لالی پاپ مانگنے، کارٹون سے دل بہلانے اور کھیلوں کے ریکارڈ یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اتنی عمر میں یہ تاریخ ساز شخص دنیا کے سب سے مشکل قلعے کو فتح کرنے کی تمنا دل میں پالتا تھا۔حکومت ملنے کے بعد اس نے اپنے اس عزم کو سچا کر دکھایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

عظیم بشارت کا مصداق بنا۔ احادیث میں فتح قسطنطنیہ کا ذکر دو مرتبہ آتا ہے۔ پہلی مرتبہ پورا ہو چکا ہے۔ دوسری مرتبہ اس کا تذکرہ علامات قیامت کے ضمن میں ہے جب حضرت مہدی کی قیادت میں یہ شہر فتح ہوگا اور مسلمان ابھی مالِ غنیمت بھی تقسیم نہ کر پائیں گے کہ یہود کے عالمی لیڈر دجال کے خروج کی خبر ملے گی تو اس کے خاتمے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے۔ قسطنطنیہ کی پہلی فتح سے یورپ کی چابی مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی مگر یورپ پھر بھی ہماری دسترس سے دور رہا اور آج ہم اس کے کنارے پر بیٹھے اس سے یورپی یونین میں شمولیت کی التجا کر رہے ہیں۔ اب یہ بات ان شاء اللہ اس کی دوسری فتح کے بعد پوری ہو کر رہے گی کہ یہ خطہ اسلام کے سائے میں پناہ لے گا اور اس خطے کے باسیوں نے جن براعظموں (امریکا اور آسٹریلیا) کو دریافت کر کے ان پر حکمرانی کا سکہ بٹھایا ہے وہ بھی ان شاء اللہ حلقہ بگوش اسلام ہوں گے۔ جس طرح نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بشارت حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی ہے اسی طرح ان کی دوسری پیش گوئی بھی ضرور پوری ہو کر رہے گی اور مسلمان اپنی پہلی غلطی کا کفارہ ادا کر کے دم لیں گے۔ ان شاء اللہ۔

معرکے کی تیاری:

سلطان محمد فاتح نے فتح قسطنطنیہ کی بشارت والی احادیث بھی سن رکھی تھیں، اسے اپنے باپ دادا کی خاندانی وصیت بھی یاد تھی اور قیصر قسطنطنیہ سے دادا کے انتقام کا عہد بھی اسے بے چین کیے ہوئے تھا کہ اتنے میں قسطنطنیہ کے بازنطینی حکمران نے اس کے باپ سے کیا ہوا صلح نامہ توڑ کر اس کے علاقوں میں شورش پھیلانے کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی ''آ بیل مجھے مار'' کا مصداق تھی اور اس واقعے نے سلطان کے دل میں اس شہر کو تسخیر کرنے کے عزم کی آگ اس قدر بڑھکائی کہ اس نے اس مہم کو اپنا حاصلِ زندگی بنا لیا۔ وہ اس حوالے سے شب و روز اس قدر متفکر رہتا تھا کہ رات بھر کروٹیں بدلتا تھا اور کسی پہلو اسے چین نہ آتا تھا۔

ایک رات اس کا اضطراب اس قدر بڑھا کہ اس نے اپنے وزیر خلیل پاشا کو طلب کیا اور کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ بے چینی، اضطراب و بے قراری سے میری کیا حالت ہے؟ میں تم سے اور تمہارے رفقاء سے ایک سوال کرتا ہوں کہ قسطنطنیہ لینے میں میری مدد کرو۔ وفادار وزیر نے عہد کیا کہ اس کا ساتھ دینے میں کسر نہیں چھوڑے گا۔ قسطنطنیہ چونکہ بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت اور بازنطینی حکمرانوں کے لیے ایسا سنگین حصار تھا جس کی محفوظ پناہ میں بیٹھ کر وہ عثمانی سلطنت کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے اس لیے اس کا زیر کرنا سلطان کی مجبوری بھی بن چکا تھا لیکن وہ جذبات کو عقل کے اور حوصلہ کو تدبیر کے تابع رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے سامنے وہ سخت ترین مورچہ ہے جسے اعلیٰ منصوبہ بندی، بہترین تدبیر اور غیر معمولی شجاعت کے بغیر فتح کرنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے اب تک کے محاصروں کا باریک بینی سے جائزہ لے کر اس شہر کے سرنگوں نہ ہونے کے اسباب متعین کئے اور ہر پہلو سے ایک فیصلہ کن معرکے کی تیاری شروع کردی۔

باسفورس کے کنارے:

وہ خود بہترین سالار اور ریاضی و انجینئر نگ کا ماہر تھا۔ عثمانی بادشاہوں کی نشست گاہ میں دنیا کا نقشہ اس نے سب سے پہلے آویزاں کیا تھا جسے اس کے جانشین دیکھ دیکھ کر عزم و حوصلہ حاصل کرتے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ جب بھی محاصرہ کامیاب ہونے لگتا ہے قیصر اپنی سازشی تدبیروں سے عثمانی علاقوں میں پھوٹ ڈلوا دیتا ہے۔ اس واسطے پہلے اس نے عدل و انصاف کے قیام اور بغاوت کے خاتمے کے ذریعے اپنی پوری مملکت میں امن و امان قائم کیا۔ اس نے اپنے دیرینہ دشمن ہنگری کے مشہور جنگجو سپہ سالار ہونیاڈے سے صلح کرلی، کرمانیہ کے سردار سے صلح کر کے اس کی لڑکی سے عقد کرلیا، قیصر کے بھائی موریا کے حاکم تھے۔ سلطان نے ایک لشکر کو وہاں بھیج کر ان کی طرف سے کمک آنے کا راستہ مسدود کردیا۔

آبنائے باسفورس کے ایک طرف ایشیا تھا اور ایک طرف یورپ۔ اس کے پردادا سلطان بایزید نے ایشیائی ساحل پر قلعہ تعمیر کیا تھا۔ سلطان محمد فاتح نے یورپی ساحل پر زبردست قلعہ تعمیر کروانا شروع کیا جو قسطنطنیہ کی فصیل سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ قلعہ 856ء کے موسم سرما سے قبل تیار ہوگیا اور آبنائے باسفورس (جہاں آج کل مسلم دنیا کا حسرت زدہ نوجوان یورپ جانے کے لیے سمندر میں ڈوب کر جانیں گنواتا ہے یا سرحدی محافظوں کے ہتھے چڑھ کر رسوا ہوتا ہے) دونوں طرف سے ترک مجاہدین کے قبضے میں آ گئی۔ نقشے میں دیکھئے کہ بحیرۂ اسود کو بحیرۂ مرمرہ سے آبنائے باسفورس ملاتی ہے اور بحیرۂ مرمرہ کو بحیرۂ ایجین سے درۂ دانیال جوڑتا ہے۔ آگے جا کر یہی سمندر (بحیرۂ ایجین) بحرِ متوسط میں ضم ہو جاتا ہے۔

کارناموں کا کارنامہ

تخلیقی سوچ کا شاہکار:

سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کے اردگرد قدم جمانے اور محاصرے کی ممکنہ رکاوٹیں دور کرنے کے ساتھ ساتھ آزمودہ کار مجاہدین کے دستے تشکیل دے رہا تھا اوران کے لیے تمام سامان اپنی ذاتی نگرانی میں مہیا کرنے کی مہم میں لگا ہوا تھا۔قسطنطنیہ یورپی دنیا کا وہ سیاسی و مذہبی مرکز تھا جسے فتح کرنے کے لیے روایتی جنگی تیاریاں کافی نہ تھی۔ سلطان کو اس امر کا احساس تھا اور وہ اپنی غیر معمولی عسکری ذہانت (Military Genius) کو کام میں لاتے ہوئے کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا جو اس کے حریف کو ششدر اور حیرت زدہ کر کے رکھ دے اور اسے سنبھلنے کا موقع اس وقت تک نہ ملے جب تک شکست کی مضبوط پکڑ اس کو چت نہ کردے۔ جنگ میں کامیابی کے لیے کچھ تو قسمت کا اچھا ہونا بھی ضروری ہے۔ آسمان و زمین کے مالک رَبّ کائنات سے مدد کی دعا سلطان کا دائمی معمول تھا۔ جنگ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اس نے اپنے تمام مجاہدین کے ساتھ مل کر دو رکعت نماز پڑھی اور عاجزی و زاری کے ساتھ خصوصی دعا کی۔ علاوہ ازیں وہ امورِ حرب کے بارے میں مسلسل استخارہ کرتا

تھا، نیز اپنے وقت کے مشہور بزرگانِ دین کی مجلس میں حاضری دیتا اوران سے دعاؤں کی عاجزانہ درخواست کرتا۔ اس حوالے سے آقائے شمس الدین اورآقائے بیّن نامی صاحبِ کشف اورمستجاب الدعوات بزرگوں کے نام ملتے ہیں۔ کامیاب کمانڈر کے لیے ایسی تخلیقی سوچ بھی ضروری ہے جواسے روایتی طریقوں سے ہٹ کر انقلابی طریقے ایجاد کرنے کی رہنمائی کرے ورنہ وہ اپنی قوم کو فتح کا تحفہ نہیں دے سکتا۔ قدرت نے سلطان کواس نعمت سے بھرپور نوازا تھا اوراسے ایسی ناقابلِ تسخیر قوت ارادی دی تھی جو ناممکن کوممکن کردکھاتی ہے۔ اس نے اپنی زنبیل سے یکے بعد دیگرے ایسے تین داؤ برآمد کیے جواس سے پہلے جنگ کے میدانوں میں نہ کھیلے گئے تھے۔

توپ اور مینار:

(1) سب سے پہلے اس نے قسطنطنیہ کی مضبوط فصیلوں کوتوڑنے کے لیے خاص طور پر بھاری توپیں بنوائیں جن کی اس زمانے میں نظیر نہ تھی۔ مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں قلعہ بند شہر کوتوڑنے کے لیے توپوں کا استعمال پہلی مرتبہ قسطنطنیہ میں ہوا تھا۔ سلطان نے ہنگری کے ایک انجینئر کی خدمات حاصل کرکے ایسی توپ ڈھالی تھی جو 300 کلووزن کا گولہ ایک میل سے دورتک پھینکتی تھی۔

(2) پھراس نے پہیوں پر چلنے والے لکڑی کے اونچے اونچے مینار بنوائے جوشہر کی فصیل جتنے اونچے تھے۔ ان کے سرے پر برج کی شکل کا مورچہ ہوتا تھا اس میں مجاہد بیٹھتے تھے۔ ان میناروں کے ساتھ ایک لمبی سیڑھی بندھی ہوتی جس کوخندق کے پار قلعے کی فصیل پر رکھ کرپُل سا بنالیا جاتا اورشہر کی دیوار پر اترنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ قسطنطنیہ والوں نے جنگ کی غیرمعمولی تیاری کی تھی۔ وہ توپوں سے منہدم ہونے والی فصیل کی جلدی سے مرمت کردیتے تھے اورمٹی کے تیل سے جلتے ہوئے گولے لکڑی کے برجوں پر پھینک کرانہیں

آ گ لگا دیتے تھے لیکن سلطان اپنی دھن کا پکا تھا، اس نے محاصرے کے دوران ایک تیسری تدبیر سوچی جو ایسی دلچسپ و عجیب، نا قابلِ یقین اور انوکھی تھی کہ سلطان کی ذہانت و فراست پر زمانہ آج تک انگشتِ بدنداں ہے اور اس کی سوجھ بوجھ اور عزم و ہمت کی داد دیتا ہے۔

ناممکن سے ممکن تک:

قسطنطنیہ کا شہر مثلث نما ہے جس کے دو حصے پانی میں گھرے ہوئے تھے۔ شمال میں شاخ زریں (Golden Horn)، اس کے معنی ہیں ''سنہرا سینگ'' اس خلیج کی شکل سینگ کی سی تھی اور دھوپ پڑنے سے اس کا رنگ سنہرا ہو جاتا تھا اس لیے اسے ''گولڈن ہارن'' کہتے ہیں۔ اس کے ایک طرف کی آبادی کا نام غلطہ اور دوسری طرف کا استنبول تھا۔ غلطہ کو اب قاسم پاشا کہتے ہیں) اور جنوب میں بحرِ مرمرہ تھا۔ برّی فوجیں صرف مشرق سے حملہ کر سکتی تھیں لیکن اس جانب سے یکے بعد دیگرے تین مضبوط دیواریں شہر کی حفاظت کر رہی تھیں جن کے اوپر 170 فٹ کے فاصلے سے برج بنے ہوئے تھے اور بیچ میں 60 فٹ چوڑی اور 100 فٹ گہری خندق کھدی ہوئی تھی۔ سمندر کی جانب سے شاخِ زریں کے دہانے پر مضبوط آہنی زنجیرہ بندھا ہوا تھا جس کے ہوتے ہوئے کوئی جہاز اندر نہ آ سکتا تھا۔ جنگ کے دنوں میں اس کی حفاظت 8 بڑے اور 20 چھوٹے جہاز کر رہے تھے۔ اس طرح اس کو بجا طور پر دنیا کا سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ سلطان نے محاصرے کے ابتدائی ایام میں اندازہ لگا لیا کہ جب تک شاخِ زریں کی خلیج جو آبنائے باسفورس سے بطور شاخ قسطنطنیہ کے ساتھ چند میل چلی گئی ہے کی طرف سے حملہ نہ ہوگا، شہر فتح نہ ہو سکے گا......... لیکن اس خلیج کے دہانہ پر زبردست بحری قوت کی مدافعت کے سبب اس میں داخل ہونے کا سوچا بھی نہ جا سکتا تھا۔ سلطان اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ مسلسل دعاؤں اور استخارے کی بدولت قدرت نے اس کی دستگیری کی اور اس کی ذہانت نے ایک دلیرانہ اور

ناقابلِ یقین حد تک حیرت انگیز فیصلہ کر کے راتوں رات اس پر کامیابی سے عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے ہلکے جہازوں اور فوجی گوداموں (گولہ بارود اور سامان کے ذخیروں) کو خشکی کے راستے باسفورس کی بندرگاہ کے بالائی حصے میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ راستہ تقریباً دس میل کا تھا (نقشہ دیکھئے) اس کی زمین اونچی نیچی ناہموار تھی، جگہ جگہ درختوں کے چھوٹے بڑے جھنڈ اور ٹیلے تھے مگر سلطان کا عزم وارادہ ایسا مضبوط اور اس کے ساتھی ایسے جانثار اور فرمانبردار تھے کہ انہوں نے بظاہر ناممکن نظر آنے والی تجویز کو ممکن کر دکھایا۔

معجزہ، کرامت اور استدراج:

سلطان نے لکڑی کے تختے چربی ملوا کر بچھوائے اور 12 جمادی الاول 857ھ بمطابق 22 اپریل 1453ء کی رات 70 جنگی کشتیاں خشکی پر چلا کر ''گولڈن ہارن'' کے اندر لا پہنچائیں۔ اس دوران غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر قسم کے انتظامات کئے گئے تھے، سلطان کا بحری بیڑہ دشمن کو مصروف رکھنے کے لیے مسلسل گولہ باری بھی کر رہا تھا لیکن خشکی پر جہاز چلانے کا یہ کام اتنی پھرتی اور تیزی سے ہوا کہ بازنطینیوں کو مداخلت کرنے بلکہ اس منصوبے کو سمجھنے تک کا موقع ہی نہ ملا۔ صبح اٹھ کر جب انہوں نے فصیل سے نیچے نظر ڈالی تو ان کی حیرت اور خوف کی انتہا نہ رہی کہ نسبتاً چھوٹی اور ہلکی عثمانی کشتیاں گولڈن ہارن کے وسط میں تیر رہی تھیں اور بڑے بڑے بازنطینی جہاز دور کھڑے حسرت و بے بسی سے انہیں تک رہے تھے کیونکہ خلیج کے اتھلا ہونے کے سبب وہ ان کے قریب بھی نہ آ سکتے تھے۔ مؤرخین اور عسکری تجزیہ نگاروں نے سلطان کی اس تدبیر کو ایسا عظیم الشان اور غیر معمولی کارنامہ قرار دیا ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک جرمن مؤرخ اسٹیفن زویگ نے اسے انسانی تاریخ کا بے مثال واقعہ (Almost without parallel in history) قرار دینے کے بعد معجزوں کا معجزہ (The Miracle of

miracles) کہا ہے لیکن یہ تبصرہ صحیح نہیں، اس لیے کہ معجزہ تو وہ انوکھا اور غیر معمولی واقعہ ہوتا ہے جو کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی اور شخص کے ہاتھ پر کوئی ایسی چیز ظاہر ہو تو اگر وہ نیک ہے تو کرامت اور بد ہے تو استدراج (مہلت) کہلاتی ہے لیکن ان تینوں میں ظاہری اسباب اختیار نہیں کئے جاتے، لہٰذا سلطان کا یہ کارنامہ معجزہ یا استدراج تو ہرگز نہیں لیکن کرامت بھی نہیں، یہ تو اس کے اعلیٰ دماغ، اس کے انجینئروں کی مہارت اور رضا کاروں کی محنت کا ثمرہ ہے۔

معرکے کی رات:

محاصرے کو 51 دن گزر گئے تھے اور سلطان نے ہر طرف سے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اب آخری اور فیصلہ کن حملے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سے قبل اہلِ شہر کو جاں بخشی کے وعدے پر ہتھیار ڈالنے کا پیغام بھیجا گیا مگر انہوں نے اپنے زعم میں دفاع کی بھرپور تیاریاں کر رکھی تھیں ویسے بھی ان کا سردار دلیر اور بہادر آدمی تھا (مسلم مؤرخین نے دل کھول کر اس کی شجاعت کی تعریف کی اور داد دی ہے) اس نے خراج دینا قبول کیا لیکن شہر حوالے کرنے کی تجویز قبول نہ کی لہٰذا سلطان نے 18 جمادی الاول 857ھ 27 بمطابق مئی 1453ء کو سلطان نے آخری جنگی مشاورت بلائی اور اگلے دن علی الصبح عام حملے کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ رات سلطان سمیت تمام عثمانی مجاہدین نے ذکر و عبادت میں گزاری۔ مؤرخین کے مطابق عثمانی لشکر میں جگہ جگہ ذکر کے حلقے لگے ہوئے تھے اور وہ تسبیح و مناجات، تکبیر و تہلیل اور ذکر جلی و خفی میں مصروف تھے۔ ان میں جوش و ولولہ اور عزم و ہمت کی غیر معمولی لہر دوڑی ہوئی تھی۔

ایک بہادر جانباز:

اگلے دن آخری معرکہ شروع ہوا۔ محصور بازنطینیوں نے غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ دونوں طرف سے آگ اور خون کی بارش ہو رہی تھی۔ عزمِ مصمم کا ٹکراؤ عزمِ

مصمم سے ہو رہا تھا۔ حملہ جتنا سخت تھا مدافعت بھی اتنی ہی سخت تھی۔ دوپہر تک زوردار معرکہ رہا۔ جانبین سے جوانمردی اور شجاعت کے خوب خوب جوہر دکھائے گئے۔ سلطان گھوڑے پر سوار، اپنے پردادا (پچھلی قسط میں غلطی سے دادا لکھ دیا گیا ہے) سلطان بایزید یلدرم کی عادت کے مطابق ہاتھ میں گرز تھامے، اپنے تیار کردہ 12 ہزار پر مشتمل خصوصی لشکر "ینی چری" کی قیادت کر رہا تھا۔ اس عدد میں شاید یہ حکمت تھی کہ حدیث شریف میں آتا ہے 12 ہزار آدمی قلت کے سبب مغلوب نہیں ہوتے یعنی کسی اور سبب مثلاً گناہوں یا امیر کی عدم اطاعت کی وجہ سے شکست کھائیں تو کھائیں، تعداد کی کمی ان کے لیے مسئلہ نہیں بنتی۔ آخر کار دوپہر کے قریب جب زمین آگ کا سمندر اور آسمان دھوئیں کا بادل بن چکا تھا، دونوں طرف بے انتہا جوش و خروش تھا اور کوئی بھی ہمت ہارنے پر تیار نہ تھا، "ینی چری" کا ایک دلیر مجاہد آغا حسن جو بڑا تندرست و توانا اور قوی ہیکل مجاہد تھا قلعہ کی فصیل پر سب سے پہلے قدم جمانے اور اسلامی جھنڈا لہرانے میں کامیاب ہو گیا۔ ملتِ اسلامیہ اس بہادر جانباز کا احسان نہیں بھول سکتی کہ اس نے اس ہنگامہ خیز معرکے میں فتح کی پہلی اینٹ اپنی جان دے کر رکھی ...... لیکن افسوس کہ آج کے کتنے مسلمان اس سعادت مند مجاہد کے نام پر اپنے بچے کا نام رکھتے ہیں؟ بلکہ کتنے ہی مسلمان جانتے ہیں کہ قسطنطنیہ کی فصیل پر سب سے پہلے کون سا مجاہد چڑھا تھا؟ آغا حسن 30 ساتھیوں سمیت ناقابلِ عبور سمجھی جانے والی فصیل پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگرچہ وہ اور اس کے 18 ساتھی فصیل پر لڑے گئے زبردست معرکے میں جامِ شہادت نوش کر گئے لیکن انہوں نے دوسرے مجاہدین کے لیے اوپر چڑھنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ عثمانی لشکر قلعے پر ٹوٹ پڑا اور اسے اپنی تیز و تند یلغار میں بہاتا ہوا لے گیا۔ سلطان کی خواہش اور اعلان کے مطابق ظہر سے پہلے قسطنطنیہ فتح ہو گیا۔

ایک اور پیش گوئی:

ظہر کے وقت سلطان محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ اپنے وزراء، سپہ سالاروں اور مجاہدین کے ساتھ سینٹ رومانس کے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ یہ وہی دروازہ ہے سب سے زیادہ خونیں معرکہ لڑا گیا تھا اور قیصر قسطنطنیہ............جس کی بہادری کا اعتراف کرنا چاہیے کہ بہادری کی قدر بھی بہادری کا حصہ ہے............یہیں لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ واضح ہو کہ اس کی موت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور سچی پیش گوئی پوری ہوئی تھی ''إذا هلک قیصر فلا قیصر بعده.'''' جب قیصر طبعی موت کی بجائے قتل ہو کر ہلاک ہو گا تو پھر کوئی قیصر پیدا نہ ہوگا۔'' سلطان شہر میں داخل ہوا اور گلیوں بازاروں سے گزرتے ہوئے آیا صوفیا نامی کلیسا پہنچا۔ تواضع کے اظہار کے لیے سر پر خاک کی مٹھی ڈالی۔ اس موقع پر اس پر شکر کے جذبات کی شدت سے رقت طاری ہوگئی اور قسطنطنیہ کو مفتوح اور اجڑا ہوا دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا مشاہدہ کر کے اس کی زبان پر بے اختیار فردوسی کا یہ شعر آ گیا:

پردہ داری می کند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

(مکڑی نے شاہِ ایران کے محل میں جالے بُنے ہوئے ہیں اور افراسیاب کے گنبد پر اُلّو بول رہا ہے۔) سلطان نے گرجا میں داخل ہو کر تصویریں مٹائیں اور اذان کہلوا کر نمازِ ظہر ادا کی۔ اس اذان کے وقت جو ساڑھے 800 سالہ جدوجہد اور قربانیوں کا ثمر تھی، مؤذن اور حاضرین پر جو کیف طاری ہوا ہوگا اس کا بس اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ عیسائیوں کے ہاں مشہور تھا کہ اگر کسی نے اس قلعے کو فتح کیا تو اس گرجے کے قریب پہنچنے پر آسمانی فرشتہ نازل ہوگا اور اسے ہلاک کردے گا۔ سلطان تزک و احتشام اور عجز و انکساری کے امتزاج کے ساتھ گرجے میں داخل ہو، آسمان سے تو کوئی فرشتہ نہ اترا البتہ موقع پر موجود

عیسائیوں نے پادریوں کی من گھڑت روایات کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

فتح کے بعد سلطان نے پوری اسلامی دنیا میں خوشخبری بھیجی جس سے دنیائے اسلام کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس دن سے اس کے نام کے ساتھ ''فاتح'' کے لقب کا اضافہ ہوا آج تک مسلم وغیر مسلم تمام مؤرخین اسے اسی نام سے یاد کرتے ہیں اور رہتی دنیا تک اسے اسی طرح عزت واحترام سے پکارا جاتا رہے گا۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

بحرِ ظلمات کے پار

غزوۃ البحر کا آغاز:

دو شماروں کے وقفے کے بعد اب ہم سلسلۂ کلام کو وہاں سے جوڑتے ہیں جہاں پر اسے چھوڑا تھا۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان فاتحین نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں جب شام (اس زمانے میں حدود شام میں یہ تین علاقے شامل تھے جو اب ملک بن گئے ہیں: اردن، فلسطین، لبنان) کو یورپ کی عیسائی سلطنت (بازنطینی بادشاہت) سے چھڑوایا تو اب ان کے سامنے پیش قدمی کے دو راستے تھے۔ قسطنطنیہ کی طرف بڑھ کر یورپ کے دروازے کی چابی حاصل کریں اور گوروں کی سرزمین میں اس طرح فاتحانہ پیش قدمی شروع کریں جس طرح گورے آج تک اِن کی سرزمین پر قبضہ کرتے چلے آئے تھے یا پھر صحرائے سینا عبور کر کے براعظم افریقہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اسے صدیوں سے چھائی جہالت کے اندھیروں سے آزاد کرانے کی کوشش کریں۔ براعظم یورپ اور ایشیا کے درمیان چونکہ بحیرۂ مرمرہ حائل ہے اور اس تک دو تنگ سمندری دروں .... آبنائے باسفورس اور درۂ دانیال .... میں سے کسی ایک کو عبور

کر کے ہی پہنچا جا سکتا ہے، اس لیے قسطنطنیہ تک رسائی کا معاملہ بحری بیڑے کی تیاری اور ''غزوۃ البحر'' کے آغاز تک مؤخر ہوتا رہا۔

اے اللہ! گواہ رہنا:

مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ اعزاز حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا کہ انہوں نے پہلا اسلامی بیڑہ تشکیل دے کر اس شہر پر حملے کے لیے روانہ کیا، البتہ براعظم افریقہ تک چونکہ صحراء سینا کی سومیل چوڑی پٹی سے گزر کر پہنچا جا سکتا ہے اس لیے فتحِ شام کے فوراً بعد مسلمان مجاہدین حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سالاری میں براعظم افریقہ میں داخل ہو گئے اور مصر کی فتح سے اس براعظم میں اسلام کے داخلے کا آغاز کیا۔ مصر کے بعد اسلامی لشکر افریقہ کی شمالی پٹی کو اسلام کی کرنوں سے منور کرتا ہوا موجودہ لیبیا، الجزائر، تیونس اور مراکش سے گزر کر بحرِ ظلمات (بحرِ اوقیانوس) تک آ پہنچا۔ یہاں آگے پھر سمندر حائل تھا جسے پار کرنے کے لیے درکار اسباب اس زمانے میں دستیاب نہ تھے۔ مسلمانوں کے امیر عقبہ بن نافع نے یہیں اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال کر یہ تاریخی الفاظ کہے تھے: ''**اللّٰھم اشھد أنی قد بلغت المجھود، ولو لا ھذا البحر لمضیت فی البلاد أقاتل من کفربک، حتّی لا یعبد أحد دونک.**''، (اے اللہ! گواہ رہنا کہ میں نے اپنی طاقت کے بقدر کوشش کر لی ہے، اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں اس کے پار واقع ملکوں میں ضرور پہنچ جاتا، آپ کو نہ ماننے والوں سے اس وقت تک قتال کرتا جب تک آپ کے سوا سب کی عبادت ختم کر دی جاتی۔)

(ریاض النفوس: ص 25، بحوالہ موسوعۃ الفداء فی الاسلام: ج 2، ص 371)

یورپ کے دو دروازے:

عقبہ بن نافع کے گھوڑے نے جس ریتیلے ساحل پر اپنے سُم مارے تھے وہاں سے آگے سمندر میں چند بے آباد جزائر تھے جنہیں ''جزائر خالدات'' کہا جاتا ہے۔ ان کا موجودہ

نام کینز آئی لینڈ ہے۔ یہ اس وقت کی معلوم دنیا کی آخری سرحد سمجھے جاتے تھے اور قدیم جغرافیہ میں صفر درجہ طول البلد یہیں سے شمار کیا جاتا تھا۔ اس وقت تک انسان کا علم اور رسائی اس سے آگے نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مراکش کو ''المغرب'' یا ''المغرب الاقصیٰ'' کہا جاتا تھا یعنی دنیا کی مغربی جہت میں آخری ملک اور آج تک عرب دنیا میں اس کا یہی نام چلا آتا ہے۔ یہ پہلی صدی ہجری کی آخری دہائیوں کی بات ہے۔ اس کے تقریباً 800 سال بعد جب زیادہ گنجائش اور لمبا بحری سفر کرنے کی صلاحیت رکھنے والے بحری جہاز بنا لیے گئے تھے اور انسان جغرافیائی اکتشافات میں اضافہ کرتے ہوئے نئی دنیائیں دریافت کر رہا تھا، ایسا لمحہ آ گیا تھا جب مسلمان اس بحرِ ظلمات کے پار واقع دنیا کو دریافت کر کے اسے مسلمانوں کا مسکن بنا لیتے .... لیکن اس وقت ان میں بداعمالیوں کا اتنا زور ہو گیا تھا کہ وہ اس اعزاز کے مستحق نہ بن سکے۔ دوسرے تاریخی موقعے سے ہماری یہی مراد ہے اور اس روداد کی ابتداء اس دن سے ہوتی ہے جب مسلمانوں نے مراکش کی شمالی سمت نظر ڈالی تو انہیں بحیرۂ روم اور بحرِ اوقیانوس کو ملانے والے تنگ سمندری درّے کے پار ایک حسین اور سرسبز و شاداب دنیا نظر آئی۔ یہ ہسپانیہ کی جنت نظیر زمین تھی اور یہ درّہ بعد میں ''آبنائے جبل الطارق'' کہلایا۔ (اہلِ مغرب جبل الطارق بگاڑ کر جبرالٹر کہتے ہیں) ''آبنائے باسفورس'' اور ''آبنائے جبل الطارق'' براعظم یورپ کے دو دروازے ہیں۔ ایک مشرقی سمت میں اور دوسرا جنوبی سمت میں۔ مسلمان ان دونوں دروازوں سے داخل ہو کر اس ظلمت کدے میں بہت آگے تک چلے گئے تھے۔ ان کا دوسری سمت تک پہنچ جانا اس کرۂ ارض کی خوش نصیبی ہوتی مگر ان کو دونوں مرتبہ واپس آنا پڑا اور یورپ نے ان کے چھوڑے ہوئے علوم سے استفادہ کر کے حیرت انگیز ترقی کرتا گیا۔ اس نے شمالی وجنوبی امریکا کے علاوہ آسٹریلیا اور بحرالکاہل کے بہت سے جزائر کو دریافت کیا لہٰذا آج کی دنیا کے یہ چاروں براعظم عیسائیت کے جھنڈے تلے جمع ہیں اور مسلمانوں کے لیے روز بروز زمین تنگ کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اصل حقدار کون؟

عبدالرحمٰن بن معاویہ دسویں اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا پوتا اور معاویہ بن ہشام کا بیٹا تھا۔ عبدالرحمٰن اسلامی تاریخ میں کئی ناموں سے منسوب ہے۔ عبدالرحمٰن بن معاویہ، عبدالرحمٰن الناصر، عبدالرحمٰن اوّل اور عبدالرحمٰن الداخل۔ 750ء میں جب عباسیوں کے ہاتھوں اموی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اموی خانوادے اُمرا، حکام اور متعلقین کو پہلے عباسی خلیفہ عبداللہ السفاح کے ہاتھوں بہت ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہزیمت اور ابتلا کے اس کارزار سے بیس سالہ اموی شہزادہ عبدالرحمٰن کسی نہ کسی طرح بچتا بچاتا صحراؤں اور دریاؤں کو عبور کرتا فلسطین پہنچا۔ فلسطین سے بحیرۂ روم کے ساحل پر مغرب کی طرف چلتے چلتے لیبیا کے لق ودق صحرا میں آ نکلا۔ صحراؤں میں قریب دو ہزار میل کا سفر کر کے عبدالرحمٰن الجیریا پہنچا اور الجیریا کے ساحلی علاقے میں آباد بربر قبیلہ نفرہ میں اپنے ننھیالی عزیزوں کے پاس پناہ گزین ہوا، مگر عباسی حکومت کے جاسوس جو عبدالرحمٰن کے قتل پر مامور تھے، مسلسل تعاقب میں رہے اور اسے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔

754ء تک عبدالرحمٰن ساحل سمندر، کوہِ اطلس کی گھاٹیوں اور صحرا کے لق ودق میں

سرگرداں رہا۔ اس دوران نہ تو اس کے پائے استقامت میں لرزش آئی نہ اس کا آہنی عزم متزلزل ہوا۔ صعوبتوں نے جب شمالی افریقا میں بھی عبدالرحمٰن کا پیچھا نہ چھوڑا تو اس نے اندلس کی راہ لی۔ اندلس میں بھی عبدالرحمٰن کے اقربا موجود تھے اور وہاں مسلمانوں کی حکومت پر قریب نصف صدی بیت چکی تھی لیکن اندلس کی حالت دگرگوں تھی، مسلمانوں کے گروہ آپس میں متحارب، حکومت کمزور، حکمران جاہ پسند اور عیش کوش تھے۔ اندرونی و بیرونی سازشیں زوروں پر تھیں۔ حکمران نیم بیدار اور عمال برسر پیکار تھے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے بربر حمایتیوں پر مشتمل لشکر تیار کیا، اندلس میں مسلمان سرداروں کی حمایت حاصل کی اور ستمبر 755ء میں اندلس میں داخل ہوا۔ یہیں سے عبدالرحمٰن کو عبدالرحمٰن الداخل کہا جانے لگا۔

عبدالرحمٰن الداخل کی کرشماتی شخصیت اور بے مثل قائدانہ صلاحیتوں کے سبب بلا امتیاز قبیلہ و نسل بے شمار اندلسی مسلمان اس کے پرچم تلے جمع ہو گئے جن میں یمانی قبیلے کے افراد نمایاں تھے۔ یہاں سے عبدالرحمٰن نے اپنے لشکر کے ہمراہ قرطبہ کا رخ کیا اور عباسیوں کے نامزد والی اندلس یوسف فہری کے لشکر کو کاٹ کر رکھ دیا۔ عبدالرحمٰن الداخل فتح یاب ہوا اور قرطبہ میں تباہ حال امویوں کی امارت کی بنا ڈالی۔ عبدالرحمٰن کی حکومت ابھی اپنے پاؤں پر کھڑی بھی نہیں ہوئی تھی کہ خلیفہ ابوجعفر منصور کے حکم سے شمالی افریقا کا گورنر ابن مغیث بہت بڑے لشکر کے ساتھ قرطبہ پر حملہ آور ہوا اور عبدالرحمٰن کو ایک اور کارزار میں اترنا پڑا۔ اس معرکے میں عبدالرحمٰن کی شان ہی نرالی تھی، وہ جدھر کا رخ کرتا صفیں کاٹتا چلا جاتا، شمالی افریقا کے جنگجو بربر تلوار زنی میں ایسی مہارت، چابک دستی اور بے جگری پر حیران رہ گئے۔ عربوں کی ایسی شجاعت اور دلیری انہوں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ بالآخر عبدالرحمٰن کامران ہوا اور ابن مغیث کا کٹا ہوا سر روایت کے مطابق بغداد میں خلیفہ منصور کو بھیج دیا گیا۔ خلیفہ ابو جعفر منصور نے جانی دشمنی اور روایتی مخالفت کے باوجود اسے اس کی اس بے جگری پر ''صقر

قریش''، یعنی قریش کے شہباز کا لقب دیا۔

فتح اور کامرانی کے مشکل مرحلے کے بعد حکومت چلانے کا مشکل تر مرحلہ شروع ہوا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے سامنے بے شمار سنجیدہ مسائل میں سے سب سے سنگین مسئلہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات ختم کرکے انہیں ایک قوم کے روپ میں ڈھالنا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کی انقلابی پالیسیوں اور ترقی پسند خیالات نے مسلم ہسپانیہ کی کایا پلٹ دی۔ عیسائی امرا اور منتظمین کلیسا کے آہنی پنجے سے مظلوم عوام آزاد ہونا شروع ہو گئے۔ غلاموں سے بدتر زندگی گزارنے والے کاشتکاروں کو بڑے زمین داروں کے جبر سے رہائی ملی، زرعی اصلاحات نافذ ہوئیں، مالیے میں کمی ہوئی اور اسے پیداوار سے منسلک کیا گیا۔ عبدالرحمٰن الداخل نے ہسپانیہ میں پہلی بار فوج میں تنخواہوں کے عوض بھرتی کا نظام جاری کیا۔ ذرائع آبپاشی میں توسیع کی گئی۔ سماجی انصاف، عدل اور دادرسی نے کمزور طبقوں میں زندگی کی حرارت پھونک دی۔ اندلس میں مدرسے، کتب خانے اور عدالتیں قائم ہوئیں۔ علم وفن کو فروغ حاصل ہوا۔ زراعت اور صنعت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ عرب اور مشرقی ممالک سے بیج اور پودے منگوا کر نئی فصلوں، پھلوں اور پھولوں سے اندلس کی سرزمین کو روشناس کرایا گیا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے اندلس ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ دور دراز سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ کوئی علم کی پیاس بجھانے کو چلا آتا تھا اور کوئی جاہ کی طلب میں۔ تجارت اپنے عروج پر پہنچی۔ بازار میں کاغذ اور کتابیں افراط سے دستیاب تھیں جس کا ابھی یورپی ممالک میں تصور تک نہیں تھا۔ اندلس کی منڈیوں میں قالین، ریشم، اسلحہ، خوشبویات، ملبوسات، آرائشی سامان، کاغذ، کتابیں، دھاگا، جوتے، چٹائیاں، زعفران، سرکہ، گرم مصالحے، رنگ، پھل، پھول، مٹھائیاں، دوائیاں، خشک میوہ جات، صابون اور سامانِ خورد ونوش بکثرت دستیاب تھا۔

عبدالرحمٰن الداخل نے 32 برس حکومت کی اور اس دوران اس نے اپنے تدبر، شجاعت اور رواداری کے بہترین مظاہروں سے ہسپانیہ کے وسیع علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لیے۔ اندلس میں مسلم اقتدارِ اعلیٰ کا جو پودا عبدالرحمٰن الداخل نے لگایا تھا وہ کسی نہ کسی طرح سرزمین اندلس میں قریب آٹھ صدیوں تک قائم رہا۔ عبدالرحمٰن الداخل کا سب سے منفرد اعزاز جو اسے کسی بھی معاصر یورپی حکمران سے ممتاز اور برتر بنا دیتا ہے، وہ اس کا آٹھویں صدی میں علم وفن کا قدردان ہونا ہے۔ وہ خود باکمال رجزیہ شاعر، علم بیان میں یکتا، علم وہنر کا قدردان اور اصحاب علم وعرفان کی صحبت میں راتیں گزارنے والا بیدار مغز حکمران تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے اسی علمی وتہذیبی رویے سے اگلی دو صدیوں میں اندلس سے ایسی روشنی پھوٹی جس سے آنے والا زمانہ منور اور خصوصاً یورپ منورتر ہو گیا۔

اندلس کی سرزمین سے علما وفضلا، سائنس دان وفلسفی، ریاضی دان اور کیمسٹ، ماہرین فلکیات اور ماہرین طب، جغرافیہ دان اور تاریخ دان غرض یہ کہ ہر شعبے میں ایسے ایسے مشاہیر پیدا ہوئے کہ جن کی علمی وتحقیقی کاوشوں نے یورپ کی موجودہ تمدنی ترقی پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ حقیقت اب تحقیق ہو چکی ہے کہ یورپ کی ترقیاتی اساس اور علمی ساخت پر مسلم مشاہیر کی گہری چھاپ ہے۔ عبدالرحمٰن الداخل نے علم ودانش کا جو پودا اندلس کی سرزمین میں بویا تھا، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ابن زیدون، ابن عمار، ابن رشد، ابن الخطیب، ابن باجہ، ابن طفیل، ابومحمد العسالی، الادریسی، ابن زہر، ابن بیطار، اکبر محی الدین العربی، ابن حزم، اسحٰق موصلی، لسان الدین الخطیب، ابن ہانی، احمد القصیلی، ثابت ابن قراح، حنایان ابن اسحٰق، یوحنا ابن مساویہ اور الفارابی کی صورت تناور درخت بن گیا۔

عبدالرحمٰن الداخل کی شخصیت بڑی دل آویز تھی۔ طویل قامت، چھریرا بدن، عقابی نظریں، سخت کوش، رزم گاہ کا شیر، ذہانت بے پناہ، اعتماد اور حوصلے میں غیر متزلزل، فوری

قوتِ فیصلہ، اٹل ارادہ، مہذب لہجہ، شائستہ اطوار۔ عبدالرحمٰن الداخل حضرت خالد بن ولید، ابوعبیدہ بن الجراح، قعقاع بن عمرو، صلاح الدین ایوبی اور امیر تیمور گورگان جیسے نامور سپہ سالاروں کی طرح اگلی صف میں صف آرا ہوتا۔ بڑھ کر حملہ کرتا اور آخر تک میدان کارزار میں جما رہتا۔ عبدالرحمٰن کو اچھے شعر کا لپکا تھا۔ وہ عرب ثقافت کی روایت میں رجز لکھنے اور پڑھنے میں ممتاز اور شعری لطافت میں بے مثال تھا۔ اس حوالے سے عبدالرحمٰن الداخل نے مسلمانوں کے اوّلین غزاوت کی یاد تازہ کردی۔ جن میں مسلم سپہ سالار، سردار اور امیر دورانِ جہاد اپنے ہی لکھے ہوئے جوشیلے رجز بآوازِ بلند پڑھتے رہتے تھے، جو لشکریوں کے دل گرما دیتا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے اشعار سے ایک رجزیہ بند کا اردو ترجمہ شیخ منظور الٰہی نے اپنی کتاب نیرنگ اندلس میں نقل کیا ہے جو اپنی مثال آپ ہے:

سوز دروں سے سلگتا ہوا
وہ میں ہی تھا، تن تنہا
جس نے دو دھاری شمشیر برہنہ کی
صحرا کو عبور کیا اور سمندر کو چیرتا چلا گیا
بیابان اور لہریں مسخر کر کے ایک سلطنت بزور حاصل کی
اور صلوٰۃ کے لیے ایک مسجد کی بنا رکھی
لشکر جو تتر بتر ہو چکا تھا
از سرِ نو منظم کیا
اور اجڑی بستیوں کو پھر سے بسایا

حریف ہونے کے باوجود خلیفہ ابوجعفر منصور نے عبدالرحمٰن کو ''صقر قریش'' قرار دیا اور امرائے عرب نے ''آبروئے عرب''۔ علامہ اقبال نے جب قرطبہ میں اپنی مشہور نظم مسجد

قرطبہ لکھی تو ان کے ان اشعار کا محرک ومخاطب عبدالرحمٰن الداخل ہی تھا۔

مرد سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اُس کی پنہ لا الٰہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل وپاک باز

یہاں پہنچ کر ہم قارئین کی توجہ مغربی مفکرین کے اس تعصب کی طرف دلوانا چاہیں گے جو تحقیق جیسے دیانت طلب شعبے میں بھی اہل مغرب کی جان نہیں چھوڑتا۔ امریکا کے شہرت یافتہ سائنس دان اور تاریخ نویس ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے 1978ء میں لکھی جانے والی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''سو انتہائی اثر انداز تاریخی شخصیات کی درجہ بندی'' میں امیر عبدالرحمٰن الداخل کا موازنہ مغربی یورپ کے مشہور رومن بادشاہ ''یگنس شارلیمین'' سے کرتے ہوئے شارلیمین کو ترجیح دے کر اس کا شمار سو مشہور اثر انداز شخصیات میں کیا ہے جبکہ شارلیمین جیسا ان پڑھ کسی طرح امیر عبدالرحمٰن الداخل کے مقابلے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ہم ذیل میں شارلیمین کے کردار، کارکردگی، فتوحات اور مابعد فتوحات کا تجزیہ پیش کر کے نتیجہ

انصاف پسند تاریخ دانوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔

شارلیمین کی حکومت مغربی یورپ میں فرانس، سوئٹزرلینڈ، بیلجیم اور ہالینڈ پر مشتمل تھی، جب کہ اٹلی، جرمنی اور آسٹریلیا کے آدھے حصے بھی شارلیمین کی قلمرو میں شامل تھے۔ 773ء میں مسلم ہسپانیہ کا سرحدی علاقہ جو فرانس کی سرحد کے ساتھ ساتھ دریائے ابرہ پر واقع تھا۔ خاصی تگ ودو کے بعد شارلیمین ہسپانیہ کا یہ زرخیز سرحدی رقبہ بھی علاقائی سازشوں کے طفیل اپنی سلطنت میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ہمیشہ مسلم ہسپانیہ پر قبضے کی خواہش اور منصوبہ بندی میں مبتلا رہا۔ مسلم ہسپانیہ پر قبضے اور عبدالرحمٰن الداخل کے خلاف ریشہ دوانیوں میں شارلیمین کو عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کی حمایت اور مدد حاصل رہی۔ شارلیمین اپنے وقت کا بہت بڑا فاتح، عیسائیت کی تاریخ کا بہت بڑا نام اور افسانوی حد تک عظیم الشان تاریخی کردار ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ یورپی حکومتوں کو عیسائیت کے زیرنگیں لانے پر کمربستہ ہوا تو ظلم وبربریت کی مثال قائم کردی۔ انصاف، تحمل، درگزر اور رواداری جیسی صفات شارلیمین سے رخصت ہوئیں یا وہ سرے سے اس میں موجود ہی نہیں تھیں۔

شارلیمین نے فروغ عیسائیت کے جنون میں 778ء میں بارسلونا (ہسپانیہ) کے مسلمان گورنر ''ابن العرابی'' سے سازش کرکے امیر ہسپانیہ عبدالرحمٰن الداخل کے خلاف ہسپانیہ میں فوج کشی کی۔ بارسلونا اور بوریا کو تاراج کیا اور سرقسطہ کی طرف بڑھا۔ یہاں عربوں نے شدید مزاحمت کی۔ بڑھتی ہوئی مزاحمت پر قابو پانے کے لیے شارلیمین نے اہل سرقسطہ پر ظلم وستم کی انتہا کردی۔ سرقسطہ کے غیرعیسائی باشندوں کو موت یا بپتسمہ لینے میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ پر مجبور کردیا اور صرف ایک دن میں ساڑھے چار ہزار افراد کو تہ تیغ کیا گیا۔ اس بربریت کے باوجود عربوں کی مزاحمت جاری رہی حتیٰ کہ شارلیمین کو سرقسطہ

سے عالم نامرادی میں پسپا ہونا پڑا۔ بوقت مراجعت جب شارلیمین کا لاؤلشکر پیری نیز کے پہاڑی دروں سے گزر رہا تھا تو امیر عبدالرحمٰن الداخل کا جرنیل حسین بن یحییٰ انصاری جسے شارلیمین کے مقابلے پر روانہ کیا گیا تھا، سر پر آن پہنچا اور شارلیمین کی عظیم الشان فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ شارلیمین کو شکست ہوئی اور اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

فوج کے اس بڑے حصے سے جو حسین بن یحییٰ کے نرغے میں آ چکا تھا اور جہاں عربوں کی تلواریں بجلی کی طرح کوندرہی تھیں اور جن کے گھوڑوں کے سموں سے چنگاریاں نکلتی تھیں، کارزار سے بھاگتا ہوا شارلیمین اس جگہ سے تیس کوس آگے جا چکا تھا۔ اس قدر آگے کہ اسے اپنے لشکریوں کی آہ و بکا سنائی دیتی تھی نہ عربوں کے دل دہلا دینے والے رجز۔ عبدالرحمٰن الداخل کے ہاتھوں یہ شکست شارلیمین کو بستر مرگ تک یادرہی۔ وہ جب تک زندہ رہا، دوبارہ مسلم ہسپانیہ کے قریب نہ پھٹکا۔ اس شکست کے بعد دریائے ابرہ کے اطراف میں ہسپانوی سرحدی علاقے شارلیمین کو اپنی گرفت سے نکلتے نظر آئے تو اس نے امیر عبدالرحمٰن الداخل سے صلح کا ڈول ڈالا۔ صلح کے اقدامات میں اپنی بیٹی شہزادی جولیانا کو امیر کے عقد میں دینے کی پیش کش کی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے جولیانا سے شادی کی تو حامی نہ بھری البتہ شارلیمین سے صلح کر لی۔

امیر عبدالرحمٰن کے ہاتھوں مذکورہ بالا تاریخی شکست کے علاوہ شارلیمین کے دامن پر ظلم اور انتقام کے چھینٹے ہیں۔ مخالفین کو اندھا کروا کر ملک بدر کر دینا شارلیمین کا پسندیدہ اقدام رہا۔ بپتسمہ یا موت، عیسائیت یا پھانسی۔ شارلیمین کے کردار میں نہ تو مذہبی رواداری کا گزر تھا نہ فراخ دلی کا عنصر۔ شارلیمین نے جس کلیسائی تنگ نظری اور اجارہ داری کو فروغ دیا اور یورپ میں پاپائیت کی جو بنا ڈالی تھی وہ 1632ء میں گیلیلیو پر کرسچین ہولی آفس (ادارۂ احتساب) کی طرف سے قائم کردہ مقدمہ اور عمر بھر کی نظر بندی کی سزا کے ساتھ اپنے عروج

پر پہنچ گئی۔ مشہور ماہر فلکیات گیلیلیو کا قصور صرف اس قدر تھا کہ وہ سورج کے بجائے زمین کو متحرک قرار دیتا تھا جو اس وقت کی عیسائیت کے نقطۂ نظر سے متصادم اور کفریہ خیال تھا۔ اسی طرح ہولی آفس کے ایک اور فیصلے کی رو سے مشہور فلاسفر جارڈینو برونو کو 1603ء میں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ ایک اور دانشور لیوڈ وشونیلیے کو بھی 1616ء میں پھانسی دی گئی۔

شارلیمین نے اپنے عہد، زمانے اور مابعد تاریخ اور نسلوں پر جو اثرات مرتب کیے ان سے علوم، سائنس، تحقیق اور یورپ پر تمدنی ترقی کے دروازے بند ہو گئے۔ علمی کاوشوں، سائنسی نظریات اور فلسفیانہ خیالات پر چرچ کی طرف سے شدید سزاؤں کے خوف نے یورپ کو جہالت کی تاریکی میں ڈبوئے رکھا۔ شارلیمین کے تاریخی اثرات کے تعین میں یورپ کی ہزار سالہ جہالت مدنظر رکھنی ضروری ہے کہ اس طویل تیرہ شبی کا آغاز بہرحال فاتح یورپ، فاتح اعظم اور عیسائیت کے نجات دہندہ میگنس شارلیمین کے ہاتھوں ہی ہوا تھا۔

یہ ہے عبدالرحمٰن الداخل اور شارلیمین کی مختصر حکایت۔ اب جب کہ ہر دونوں کے حقائق پہلو بہ پہلو سامنے ہیں تو مغرب کے مؤرخین سے سوال ہے کہ سو انتہائی مؤثر شخصیات کی فہرست میں شامل کیے جانے کا اصل حق دار کون ہے۔ عبدالرحمٰن الداخل یا شارلیمین؟؟؟

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ اسے بہرحال تاریخ دانوں کے ہاتھوں ہی لکھے جانا ہے۔ مشتہر اور اکثریتی آراء پر اقلیتی حقائق قربان ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ کمزور افراد اور اپنے ورثے کی حفاظت سے عاری اقوام کے المیوں میں سے ایک المیہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کا سچ، اصل اور سونا بھی مشتبہ، متنازع اور مٹی بن جاتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر ہارٹ جیسے مؤرخ لکھاریوں کا قصور کم اور اقوام پر طاری مسلسل خوابیدگی اور مدہوشی کا قصور زیادہ ہوتا ہے۔ ہماری خوابیدگی اور بے حسی اپنی جگہ لیکن علمی تقاضے اور تاریخی

انصاف کی خاطر سوسرِ فہرست شخصیات کی فہرست میں کم از کم امام اعظم ابو حنیفہ، عبدالرحمٰن الداخل، ابن تیمیہ، امام غزالی، امام رازی، ابن سینا، البیرونی، الخوارزمی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کو ضرور شامل کیا جانا چاہیے تھا۔

کوہ الپس سے واپسی

اندلس میں مسلمانوں کی فاتحانہ آمد کے حقیقی محرکات کو چھپانے کے لیے یورپی مؤرخین نے بہت کوششیں کی ہیں اور جن مسلمانوں نے ان تصنیفات سے استفادہ کیا ہے وہ بھی اس دُھند کے پار نہیں دیکھ سکے جو ان کے پروپیگنڈے نے تانی تھی۔ وہ حقائق جن کا کوئی غیر متعصب مؤرخ انکار نہیں کرسکتا، یہ تھے کہ ہسپانیہ کے باشندے گاتھ حکومت کے اندازِ حکمرانی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ حکمرانوں کے عیش وعشرت، پادریوں کی جنونیت، عمال کا عوام سے غلاموں جیسا سلوک اور ٹیکسوں کی بھرمار نے ان کو اپنے بادشاہوں سے متنفر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف وہ مسلمان فرمانرواؤں کے عدل وانصاف، مسلمان ممالک کی ترقی وخوشحالی اور مسلمان معاشروں میں غیر مسلموں کے حقوق کی پاسداری سے نہایت متاثر تھے اور مسلم فاتحین کے فراخدلانہ سلوک کے سبب وہ انہیں قدر ومنزلت اور محبت وشیفتگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ بالکل ایسی صورتحال تھی جیسے آج کل ہمارے ہم وطن امریکا کی 51ویں ریاست بن جانے کی باتیں ارمان کے ساتھ کرتے ہیں، چنانچہ جب ہسپانوی سلطنت کے سربراہ کی طرف سے اپنے ایک ماتحت کی بیٹی کے ساتھ بدکارانہ ظلم کے نتیجے

میں طارق بن زیاد کو ہسپانیہ پر حملے کی دعوت دی گئی اور اس نے 92ھ کی شب قدر کے ایک دن بعد 28 رمضان المبارک (19 جولائی 711ء) کو وادی لکہ کے میدان میں نا قابلِ فراموش کارنامہ انجام دیتے ہوئے شاہِ ہسپانیہ لزریق (راڈرک) کی ٹڈی دل افواج کو ایک انقلاب آفریں اور عہد ساز شکست سے دو چار کیا تو اس کے بعد اس کو اندلس میں آگے بڑھنے میں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کی بہادری، انتظام کی غیر معمولی قابلیت اور اسلامی جنگی اصولوں کے مطابق مفتوحین سے مثالی سلوک کی بدولت ہسپانیہ کی زمین اس کے لیے اپنی آنکھیں بچھاتی چلی گئی اور چند اقتدار پرستوں کے علاوہ کوئی اس کی راہ میں مزاحم نہ ہوا۔ موسیٰ بن نصیر کی آمد کے بعد تو غازیانِ اسلام سیلِ رواں کی مانند اندلس کو فتح کرتے ہوئے کوہ البرتات (کوہِ الپس) کو عبور کر کے فرانس تک جا پہنچے۔ فاتحین اندلس کے اولین کا یہ لشکر فرانس کا جنوبی علاقہ فتح کر چکا تھا کہ موسم سرما نے آ لیا۔ عرب کے صحرا نشین سردی کی شدت اور سامانِ رسد کی قلت کی وجہ سے واپس کوہ البرتات پر آ گئے جو اسپین اور فرانس کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ موسیٰ بن نصیر نے فیصلہ کیا کہ اگلے سال فرانس کو فتح کر کے سوئزرلینڈ، ہنگری اور آسٹریا، پھر قسطنطنیہ سے متصل یورپی ممالک، بلغاریہ، رومانیہ اور اٹلی کو فتح کرتے ہوئے قسطنطنیہ پہنچوں گا اور یورپ کی فتح کی تکمیل کر کے مسلمانوں کے دارالخلافہ دمشق تک زمینی رسائی کو ممکن بنا چھوڑوں گا۔ موسیٰ اور طارق کے ہمراہیوں کے بلند حوصلے اور ایمانی طاقت کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی .... لیکن اس سے پہلے کہ اسلام کی کرنیں اس پورے براعظم کو روشن کرتیں مرکز کی طرف سے موسیٰ اور طارق کو فتح یورپ کی مہم روک کر واپس دمشق آنے کا حکم ہوا۔ اس حکم نے نہ صرف ان کی اولوالعزمی کو افسردگی سے بدل دیا بلکہ اس خطے کی تقدیر کو بھی سیاہ کر دیا۔ تختِ دمشق پر فائز حکمران سلیمان بن عبدالملک کی انا پرستی اور کوتاہ نظری نے اندلس اور سندھ کے فاتحین کے

کارناموں سے مسلمانوں کو مستفیض نہ ہونے دیا، جس طارق بن زیادہ نے اندلس کو فتح کیا ہے یعنی 711ء اسی سال عرب کا نوجوان شہزادہ محمد بن قاسم سندھ اور ملتان تک جا پہنچا تھا.......... مگر حکمران وقت کی کوتاہ سوچ نے ان خطوں کی تقدیر کو اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کر دیا۔ اس نے اندلس اور سندھ کے عظیم فاتحین کو واپس بلا کر قید اور موت کے حوالے کر دیا جس کے بعد ان علاقوں میں صدیوں تک اسلام کی پیش قدمی رک گئی اور صدیوں بعد براعظم یورپ اور براعظم ہند کے دوسرے کنارے سے شروع تو ہوئی جب مشرقی یورپ کو عثمانی سلاطین نے اور شمال مغربی ہندوستان کو افغان فاتحین نے فتح کیا مگر ان کی کامیابیاں زمین تک محدود رہیں اور قرونِ اولیٰ کے مسلم فاتحین کی طرح انسانی دلوں کو فتح نہ کر سکیں کیونکہ حکمرانوں کے ذاتی کردار اور اشاعتِ اسلام کے شوق میں بہت فرق آ چکا تھا۔ مقامی آبادی میں اسلام کی ترویج کماحقہٗ نہ ہو سکی جس کے اثرات آج تک محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

اٹلی کے دروازے پر

پہلی صدی ہجری میں موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی یہ خواہش تھی کہ وہ وسطی یورپ کے ممالک کو فتح کرتے ہوئے قسطنطنیہ آئیں اور پھر اس خوبصورت نگینے کو اسلامی ممالک کی انگشتری میں جڑ کے دمشق پہنچیں.......... پوری نہ ہوسکی.......... لیکن اس کے تقریباً 700 سال بعد جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرلیا اور اس رکاوٹ کو عبور کرنے میں کامیابی حاصل کرلی جو یورپ کے مشرقی دروازے پر گڑی ہوئی تھی تو ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کو اپنے اسلاف کی یہ تمنا پوری کرنے کا موقع مل گیا کیونکہ اس وقت اندلس میں بھی ان کی حکمرانی تھی جو یورپ کا جنوبی اور جنوب مغربی خطہ تھا اور اگر مشرق سے عثمانی مجاہدین اور جنوب وجنوب مغرب سے ہسپانیہ کے مسلمان یلغار جاری رکھتے تو درمیان کی پٹی چند جنگوں کی مار تھی.......... مگر اقتدار کی ہوس اور انانیت و مفاد پرستی کا ناس ہو کہ اس نے ہسپانیہ کے مسلمانوں کی راہ دیکھ لی تھی۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ سلطان محمد فاتح نے 857ھ میں قسطنطنیہ فتح کیا۔اس کے بعد سلطان نے یورپ میں مسلسل پیش قدمی جاری رکھی حتیٰ کہ 4 جمادی الثانیہ 885ھ میں اس

کے ایک مشہور جرنیل احمد کرک پاشا نے پہلی مرتبہ اٹلی کی سرزمین پر فاتحانہ قدم رکھا۔ یہاں اس سے قبل کوئی عثمانی مجاہد نہ پہنچا تھا۔ اوٹرانٹو اٹلی کے جنوبی ساحل پر واقع اہم بندرگاہ تھی اور اس کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اٹلی کی فتح کے لیے اس پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ یہ شہر اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے گویا اٹلی کا دروازہ تھا۔ اس سے اگلے سال سلطان محمد فاتح کسی بڑی مہم کے لیے زبردست تیاری کر رہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے ارادوں کو مکمل طور پر راز میں رکھتا تھا اور اس کے بڑے کمانڈروں.......... مثلاً احمد کرک پاشا فاتح کریمیا، عمر پاشا فاتح وینس، محمود پاشا، مسیح پاشا وغیرہ جن کا شمار اس وقت دنیا کے بہترین جرنیلوں میں ہوتا تھا.......... کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ حملہ کس سمت کی طرف ہونے والا ہے۔ وہ جنگی معاملات میں رازداری کی اس حد تک پابندی کرتا تھا کہ ایک مرتبہ جب کسی مہم کے لیے فوجیں جمع ہونے لگیں تو اس کے خاص کمانڈروں میں سے ایک نے ہمت کر کے اس سے پوچھا دراصل کون سا شہر یا ملک پیشِ نظر ہے؟ اس نے بے نیازی سے جواب دیا: ''اگر میری ڈاڑھی کے ایک بال کو بھی اس کی خبر ہو جائے تو میں اسے توڑ کر آگ میں ڈال دوں۔'' لیکن بہرحال عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ غالباً روم پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں کیونکہ اوٹرانٹو کی فتح سے سلطان کے لیے اٹلی کا دروازہ کھل گیا تھا اور موقع آ گیا تھا کہ وہ اپنے آباء واجداد کی فتح روم کی دیرینہ خواہش پوری کر لے.......... لیکن اچانک 3 مئی 1481ء مطابق 4 ربیع الاول 886ھ کو جبکہ وہ صرف 51 برس کا تھا اور اسے کوئی عارضہ بھی لاحق نہ تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو اگلے سال کیا پیش آتا۔ بہرحال فاتح کی موت نے یورپ کو بچا لیا اور اس کی جان میں جان آئی۔

یورپ اس سے اس قدر مرعوب اور خوفزدہ تھا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے صفحہ 216 پر لکھا ہے کہ

سلطان محمد فاتح کے انتقال پر پاپائے اعظم نے جشنِ مسرت منانے کا حکم دیا اور فرمان صادر کیا کہ عیسائی مذہب کے تمام پیروکار تین روز تک مسلسل شکرانہ کی نمازیں پڑھیں۔'' اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پوپ کو یہ خوشی اپنی راجدھانی ہاتھ سے جاتے دیکھ کر بچ جانے پر ہی ہوسکتی تھی۔ مؤرخین کے مطابق اس وقت اٹلی کے علاوہ کوئی ایسا اہم ہدف نہ تھا جس کے لیے سلطان جیسے قابل جرنیل کو اہتمام سے تیاریاں کرنی پڑتیں نیز ہسپانیہ میں مسلمانوں کو درپیش مصائب اور سنگین صورت حال کے پیش نظر اس بیدار مغز سلطان سے یہی توقع کی جا رہی تھی کہ وہ فتحِ یورپ کی مہم کو مشرقی جانب سے جلد آگے بڑھائے گا تا کہ ہسپانیہ اور اس کے معاون عیسائیوں پر دباؤ ڈالا جاسکے۔ سلطان کی موت کے بعد نہ صرف اٹلی ممالک اسلامیہ میں داخل نہ ہوسکا (سلطان کے بیٹے بایزید ثانی نے اوٹرانٹو سے عثمانی افواج واپس بلا کر اسے اٹلی کے حوالے کر دیا تھا) بلکہ اسپین کے عیسائی بھی دیگر یورپی ممالک کی امداد سے زور پکڑتے گئے اور سلطان کی وفات کے 11 سال بعد 897ھ/1492ء میں غرناطہ میں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گُل ہوگیا۔ یورپ نے ہسپانوی مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے علوم وفنون سے خود کو آراستہ کیا اور آج اس کے فرزند زمین کی سطح اور سمندر کا سینہ کھنگالنے کے بعد ستاروں پر کمند ڈال رہے ہیں۔

ہسپانیہ کے سقوط کی داستان جو اس مضمون کا دوسرا اہم جز ہے، بڑی دلخراش ہے۔ اندلس میں جب خلافت بنواُمیہ ختم ہوئی تو تمام جزیرہ نمائے اندلس میں چھوٹی چھوٹی الگ الگ خودمختار اسلامی سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کا سربراہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کی بقا اور ترقی اسی کی حکومت پر موقوف ہے چنانچہ ان عقل کُل قسم کے سربراہوں میں سے ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے برتر سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت پر آمادہ رہتا تھا۔ اس صورت حال سے عیسائی بادشاہوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی حدود کو وسیع کرتے

ہوئے اسلامی رقبہ کو کم سے کم کرتے گئے۔ مرابطین اور موحدین کے زمانے میں ان مسلمان ریاستوں میں اتحاد کی شکل پیدا ہوگئی تھی مگر یہ عارضی ثابت ہوئی اور ان کے بعد ایک مرتبہ پھر عیسائی فرمانروا مسلم سلطنت کا حصہ دباتے اور اپنے مقبوضات بڑھاتے چلے گئے۔ اس وقت عذاب یہ تھا کہ ایک طرف تمام یورپ مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے پر متفق اور مسلم کشی کے جنون سے مغلوب تھا اور دوسری طرف مسلمانوں کے حکمران بھی ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے تھے۔ ان کے لیے حریف مسلمان کا قتل کھیل بن چکا تھا اور مسلمان کی جان لیتے ہوئے ان کی تلوار ذرا نہ ہچکچاتی تھی۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ تھی کہ ہر مسلمان رئیس دوسرے مسلمان رئیس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے عموماً کسی عیسائی بادشاہ سے اس کی من مانی شرائط پر مدد طلب کرتا تھا اور برادر کشی کے اس المناک منصوبے میں کامیاب ہونے کے بعد مفتوح کے بعض علاقے اور قلعے مددگار عیسائی بادشاہ کی نذر کر دیتا۔ اس طرح عیسائیوں کا کام خود مسلمانوں کے ہاتھوں پورا ہو رہا تھا اور وہ ان کی نالائقی اور حماقت پر ان کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر اپنی مقبوضات بڑھاتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں پر ذلت اور خواری اس حد تک طاری ہو چکی تھی کہ عیسائیوں سے معاہدے اور ان کو خراج کی ادائیگی اور قلعوں کی سپردگی میں تو کوئی عار نہ محسوس ہوتا تھا مگر اپنے مسلمان بھائی سے معاہدہ کرنے یا اس کے ساتھ اتحاد کرنے میں انہیں شرم آڑے آتی تھی۔ چنانچہ عین ان دنوں جب عثمانی مجاہدین ملک پر ملک فتح کر کے ان کی مدد کو آنا چاہ رہے تھے، اسپین میں مسلمانوں کی سلطنت سمٹ سمٹ کر غرناطہ میں محدود ہو رہی تھی۔ (از راہِ کرم ان سطروں کی عصرِ حاضر کے حالات سے کسی طرح کی مطابقت ''محض اتفاقی واقعہ'' سمجھا جائے اور کسی قسم کی عبرت یا سبق آموزی کو قریب نہ پھٹکنے دیا جائے)

غرناطہ کے ٹکسال میں

دوجنونیوں کا اکٹھ:

ہوا یوں کہ اسپین میں قستالیہ اور ارغون دو عیسائی ریاستوں پر جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں، بالترتیب فرڈینڈ اور ملکہ ازابیلا حکمران ہوئے۔ یہ دونوں مسلمانوں کے بارے میں سخت متعصب واقع ہوئے تھے اور اس وقت غضب اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب 874ھ/1469ء میں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ دونوں سلطنتیں مل کر ایک ہوگئیں اور ان دونوں نے تہیہ کرلیا کہ جزیرہ نمائے اُندلس سے اسلامی سلطنت کا نام ونشان مٹا دینا چاہیے اور یہاں قسم کھانے کو بھی ایک مسلمان زندہ نہ چھوڑنا چاہیے۔ مؤرخین نے ان دونوں کا کردار بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دونوں فرمانروا انتہائی حریص اور متعصب تھے۔ فرڈینڈ کو ملک گیری اور مطلق العنانی کی بے پایاں ہوس تھی اور ازابیلا کو دھن تھی کہ اسپین کی فضا میں کسی یہودی یا اسلامی عبادت کے الفاظ سنائی نہ دیں۔ اس بارے میں یہ جنونیت کی حد تک انتہا پسند واقع ہوئی تھی۔ یہودی تو اس سے پہلے کبھی مردِ میدان ثابت ہوئے تھے نہ اب ان سے توقع تھی کہ وہ عیسائیوں کو بھرپور مقابلہ دیں گے............ لیکن مسلمان قلم اور تلوار دونوں کے دھنی تھے اور ازابیلا ان کے خلاف

اپنی فوجوں کو بڑھکانے کے نت نئے طریقے اختیار کرتی تھی۔ کبھی اپنی فوج کے کیمپوں اور میدانِ جنگ میں زرہ پہن کر نکل آیا کرتی تھی، اس کی یہ زرہ آج تک اسپینی دارالحکومت میڈرڈ کے شاہی اسلحہ خانہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اپنے انہی زرہ پوش گشتوں کے درمیان وہ ایک مجاہد کے وار سے بال بال بچی۔ مسلمانوں کے بنائے ہوئے حسین اور پُرشکوہ محلات اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ ایک مرتبہ الحمراء دیکھنے کے شوق میں وہ غرناطہ کے اتنے قریب آ پہنچی کہ قریب تھا مسلمان مجاہدین کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے۔ ہوا یوں کہ وہ ایک قریبی گاؤں میں ایک مکان کی چھت پر اس عجائب روزگار محل کا نظارہ کرنے کے لیے چڑھی، چند مجاہدین نے تاڑلیا اور فوراً پہنچ کر اس مکان کو گھیر لیا۔ اگر اس کا فوجی دستہ عین وقت پر کہیں سے آنہ پہنچتا تو یہ عیسائی ملکہ زندگی کے بقیہ دن مسلمانوں کی قید میں گزارتی۔

احتساب، پوٹا اور پتلے:

مذہبی اعتبار سے یہ دونوں کٹر قسم کے کیتھولک تھے اور چاہتے تھے کہ سارا اسپین کیتھولک فرقہ کی شکل میں متحد ہوجائے۔ اس کے لیے انہوں نے ''احتساب'' کی بدنام زمانہ عدالتیں قائم کی تھیں۔ جس کے نگران اعلیٰ بذاتِ خود یہ دونوں تھے۔ یہ مذہبی عدالتیں اسپین کی تاریخ کا شرمناک باب ہیں۔ اس خوفناک عدالت کے سامنے ہر طبقے کے لوگ جواب دہ ہوتے تھے حتیٰ کہ وہ پادری بھی جو مسیحی عقائد سے جزوی اختلاف رکھتے تھے۔ ان کے سامنے پیش کیے جاتے اور اپنے ''ملحدانہ نظریات'' کی حسب درجہ سزا پاتے۔ ان عدالتوں کے اختیارات لامحدود تھے۔ وہ کسی کو قید میں ڈال کر مہینوں بلکہ برسوں بغیر مقدمہ کی سماعت کے یونہی مقید کر سکتے تھے اور انہیں اختیار تھا کہ سماعت سے پہلے نہ تو یہ بتاتے کہ الزام کیا ہے اور نہ یہ کہ کس نے یہ الزام لگایا ہے؟ اگر کوئی قیدی اس ''الزام'' کو قبول نہ کرے تو اسے ایسے عذاب دیے جاتے کہ اسے اقرار کرنے میں ہی عافیت نظر آتی۔ پھر اس سے کہا

جاتا کہ وہ ''بلا جبر و اکراہ'' اس الزام کو اپنی مرضی سے قبول کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لامتناہی عذاب کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا جاتا۔ سزا کی مدت اور نوعیت کا بھی کوئی لگا بندھا ضابطہ یا دستور نہ تھا، محتسب اعلیٰ صاحب.......... جو عموماً جنون زدہ پادری ہوتا تھا.......... کی صوابدید اس باب میں حرفِ آخر تھی۔ ان عدالتوں نے سبز رنگ کی صلیب کو اپنا نشان بنایا تھا اور سارا اسپین اسے دیکھتے ہی ناک رگڑنے لگتا تھا۔ اسپین کے نامی گرامی طبیب مگوئل سروتو کو مذہبی عدالت نے ملحد قرار دے کر آگ میں جلا دیا تھا حالانکہ اس کی طرف دورانِ خون کی دریافت کا کارنامہ منسوب کیا جاتا ہے۔ (منسوب کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ درحقیقت یہ اسپین کے مسلم اطباء کا کارنامہ تھا لیکن امریکا کی دریافت اور دیگر علمی، فنی اور تحقیقی کارناموں کی طرح اسپین کے مسیحیوں کے نام لکھ دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب) احتساب کے قیدی کو فیصلہ سنانا یا سزا دینا ایک دینی کام سمجھا جاتا تھا اور جو اس ''دینی کام'' کا سامنا کرنے سے بھاگ جاتا تو صدر محتسب صاحب اس کے پتلے کو آگ میں جلانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔ بھارت کا بدنام زمانہ ''پوٹا'' کا قانون اسپین کے متعصب مذہبی حکمرانوں کے اسی نظامِ احتساب سے لیا گیا ہے جس کے لیے بھارتی ماہرین کی ایک ٹیم نے خصوصی طور سے اسپین کا سفر کیا تھا.......... لیکن تاریخ نے جس طرح اسپین کے مسیحی حکمرانوں کی پیشانی پر اسے کلنک کا ٹیکہ قرار دیا ہے اسی طرح کا تذکرہ موجودہ بھارتی حکمرانوں کے بارے میں بھی ہوگا جس پر ہندو مؤرخین اور ان کی آئندہ نسلیں شرمایا کریں گی۔ آج کل مظاہروں میں جو پتلے جلائے جاتے ہیں اغلب یہ ہے کہ اس کا آغاز مجرم کی غیر موجودگی میں سزا کے اجراء کے اس طریق کار سے ہوا تھا۔

ایثار کا بے نظیر مظاہرہ:

اس وقت سلطنت غرناطہ میں جو قرطبہ اور دیگر شہروں کے سقوط کے بعد اس سرزمین

میں مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ تھی سلطان ابوالحسن فرمانروا تھا۔ اُندلس کے مسلمانوں کو طویل خانہ جنگی کے بعد ایک ایسا رہنما ملا تھا جس پر وہ متفق ہو سکتے تھے۔ یہ شخص قابل سپہ سالار اور بہترین منتظم تھا اور اس سے امید کی جا سکتی تھی کہ یہ مسلمانوں کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ اس کی تخت نشینی سے مسلمانوں کو کس قدر توقعات تھیں اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا بھائی محمد بن سعد جو الزغل کے نام سے مشہور تھا مالقہ میں اپنی امارت قائم کر چکا تھا۔ عیسائیوں نے ان دونوں کو لڑانا چاہا مگر الزغل کمال ہوشیاری، وسیع الظرفی اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً غرناطہ پہنچا اور بھائی کے ہاتھ پر بیعت کر کے دشمن کی چال کو ناکام بنا دیا۔ کاش! طبیعت کی ایسی سلامتی کا مظاہرہ بعد کے حکمران بھی کرتے تو مسلمانوں کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا کہ آج ان کی فتح کردہ سرزمین پر اللہ کا نام لینے والا قسم کھانے کو بھی کوئی نہیں ہے۔ سلطان ابوالحسن کی قیادت میں مسلمان سارے جزیرہ نمائے اُندلس سے سمٹ کر غرناطہ میں جمع ہو گئے تھے اور موت و حیات کی جنگ کو سامنے دیکھ کر اپنی گزشتہ غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ فرڈیننڈ نے سلطنت غرناطہ کے خلاف زبردست تیاریاں کرنے کے بعد 880ھ میں (یعنی سلطان محمد فاتح کی وفات سے 6 سال قبل) سلطان ابوالحسن کو خط لکھا کہ اگر خیر چاہتے ہو تو بلاتوقف ہمیں دیے جانے والے خراج کی مقدار کی اطلاع دو۔ ابوالحسن کی جگہ اور کوئی حکمران ہوتا تو اس ذلت آمیز مطالبہ کو منظور کرنے اور دنیاوی زندگی کی چند ساعتوں کی بھیک حاصل کرنے میں دیر نہ لگاتا لیکن اس نے فرڈیننڈ کو ایسا دنداں شکن جواب دیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس نے لکھا: ''غرناطہ کی ٹکسال میں اب خراج کے سکے ڈھالنے کی بجائے فولاد کی ایسی تلواریں تیار ہوتی ہیں جو عیسائی گردنیں اڑا سکیں۔'' اس جوانمردانہ جواب نے فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ کو مبہوت کر دیا حالانکہ صورت حال یہ تھی کہ جس وقت سلطان ابوالحسن تخت نشین ہوا تھا، اس وقت سلطنت

غرناطہ کا رقبہ سمٹ کر چار ہزار مربع میل سے بھی کم رہ گیا تھا اور سلطنت قستالیہ، سلطنت ارغون کے ساتھ اتحاد اور بہت سی چھوٹی مسلم ریاستوں اور شہروں پر قبضے کے بعد وسیع ہوکر سوا لاکھ مربع میل سے بھی کچھ زیادہ ہوگئی تھی.......... لیکن سلطان ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں نے جب عزم کرلیا کہ ہم اس ملک میں آزاد و خودمختار ہوکر رہیں گے اور عیسائیوں کا محکوم بننے پر موت کو ترجیح دیں گے تو اس یک لمحاتی فیصلے نے ان میں وہی عقابی روح بھر دی جو فطرتِ مسلم کا خاصہ ہے اور جس نے کئی مواقع پر کرشماتی نتائج دکھائے ہیں۔

بہادر باپ کم نصیب بیٹا:

فرڈینںڈ اور ازابیلا جو دونوں مل جل کر حکومت چلاتے اور فیصلہ کرتے تھے، اس بہادرانہ جواب کو سن کر کئی سال تک جنگ کی ہمت نہ کر سکے لیکن ان کی جنگی تیاریاں چپکے چپکے سے جاری تھیں۔ آخرکار جمادی الاولی 887ھ (سلطان محمد فاتح کی وفات کے اگلے سال) سلطان ابوالحسن کے پاس خبر پہنچی کہ فرڈینںڈ کئی سال کی تیاریوں کے بعد ایک ایسے لشکرِ جرار کے ساتھ غرناطہ کی طرف روانہ ہوا ہے جس میں یورپ کے مختلف ملکوں کے نامور سپہ سالار بھی شامل ہیں اور ان کو بڑے پادریوں نے سر پر ہاتھ پھیر کر برکت دی ہے اور تمام براعظم یورپ میں پادریوں نے دعائیں مانگی ہیں کہ اس مرتبہ اُندلس سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے میں کامیابی حاصل ہو۔ سلطان ابوالحسن ان لوگوں میں سے نہ تھا جسے اس طرح کی باتیں پریشان کرسکیں۔ اس کے مجاہدانہ جذبات کو یہ سن کر مزید مہمیز ملی اور اس نے غرناطہ میں محصور ہونے اور عیسائیوں سے دب کر لڑنے کی بجائے فیصلہ کیا کہ خود آگے بڑھ کر ان جنگجوؤں کا سامنا کرنا چاہیے چنانچہ سلطنت غرناطہ کی سرحد پر لوشہ نامی شہر کے قریب 27 جمادی الاولی 887ھ کو ایک زبردست جنگ ہوئی۔ مسلمان جان توڑ کر لڑے اور فاتحین اُندلس کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرڈینںڈ اور ازابیلا کے متحدہ لشکر کو شکست فاش دے کر پسپا

ہونے پر مجبور کر دیا۔ لشکرِ اسلام کو کثیر تعداد میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور مسلمانوں کے حوصلے اس فتح کی خبر سن کر بلند ہو گئے لیکن عین اس تاریخی لمحے میں جب لوشہ کے میدان میں سلطان ابوالحسن جیسا بہادر سالار مسلمانوں کی بقا کی جنگ میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے اپنے حریف کو شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر رہا تھا، غرناطہ میں سلطان کا کم نصیب بیٹا ابو عبداللہ باپ کے خلاف سازش کے تانے بانے بُن رہا تھا۔

بدنصیب حکمران

ابوعبداللہ تاریخِ اسلام کا وہ بدعمل اور بدنصیب حکمران ہے جو اپنے احمقانہ کرتوتوں کی بنا پر یورپ سے مسلمانوں کے اخراج اور ایسے علمی و اخلاقی، عسکری و سیاسی زوال کا ظاہری سبب بنا جس نے آج تک ہمیں ذلت کی کھائیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے والد سلطان ابوالحسن نے لوشہ کے میدان میں عیسائیوں کے متحدہ لشکر کو شکستِ فاش دے کر مسلم اسپین کے بقا، اتحاد اور نشاۃِ ثانیہ کی امید روشن کر دی تھی لیکن ابھی وہ میدانِ جنگ میں عیسائیوں کی لاشوں کے درمیان گھومتے ہوئے آیندہ کے منصوبے بنا ہی رہا تھا کہ اسے وہیں یہ دل فگار خبر سننے کو مل گئی کہ اس کے لڑکے نے غرناطہ پر قبضہ کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا؟ لے دے کے چند شہر تھے۔ ان کا بھی احمق، ناتجربہ کار اور بغیر استحقاق کے سلطنت کی حرص میں مبتلا عاقبت نااندیش شخص بٹوارہ کر چکا تھا جبکہ اسے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ باپ کے بعد اسی نے وارث ہونا تھا۔ (تھوڑے ہی عرصے بعد سلطان ابوالحسن فالج سے معذور ہو گئے تھے) اس کٹی پھٹی حکومت کو لینے میں جلدی کی بجائے اگر وہ باپ کے ہاتھ مضبوط کرتا تو مستحکم اور

وسیع سلطنت اس کے حصے میں آتی مگر اس کے کردار کے مطالعے سے لگتا ہے کہ مسلمانوں
کے اعمال کی شامت اس حکمران کی مجسم شکل میں ان پر مسلط ہوگئی تھی اور جہاں کہیں بہتری
کی امید پیدا ہوتی وہ اسے ختم کرنے کے لیے پہنچ جاتا۔ سلطان ابوالحسن کی بے بسی اور مجبوری
کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دشمن پر فتح پالینے کے باوجود وہ واپس گھر بھی نہ جاسکتا تھا،
بالآخر کوئی چارہ کار نہ پاکر وہ مالقہ چلا آیا اور یوں مسلم اسپین اس نازک وقت میں دو حصوں
میں تقسیم ہوگیا۔ نصف مشرقی حصہ میں بیٹا اور نصف مغربی حصہ میں باپ حکمران تھا۔ اس
چھوٹی سی حکومت کو صوبوں اور ٹکڑوں میں بٹتے دیکھ کر عیسائیوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ان
میں اندلس پر دوبارہ قبضہ کرنے کی (Re-Conquista) تحریک زور پکڑ گئی، چنانچہ
اشبیلیہ (اشبیلیہ اور قرطبہ سالوں پہلے مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاچکے تھے لیکن ان کی
نااتفاقی ختم ہونے میں نہ آتی تھی) اور ملحقہ ریاستوں کے عیسائیوں نے متحد ہوکر سلطان
ابوالحسن کے زیرانتظام علاقہ مالقہ پر حملہ کیا۔ بہادر سلطان نے اپنی عسکری قابلیت اور ماتحت
مجاہدین کی بے جگری کے سبب ایک بار پھر بہترین جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور اشبیلیہ
کے حاکم کو دو ہزار سواروں سمیت زندہ گرفتار کرلیا۔ باقی میدانِ جنگ میں مارے گئے یا
بھاگنے پر مجبور ہوگئے............ لیکن اس مرتبہ بھی مسلمان ابھی اس فتح کی خوشی بھی نہ منا پائے
تھے کہ خبر آئی جیسے ہی مسلمان لشکر دشمن سے مقابلے کے لیے مالقہ سے باہر نکلا ہے، حرص و
ہوس کا پیکر ابوعبداللہ مالقہ پر قبضہ کے لیے لشکر لے کر پہنچ گیا ہے۔ اب سلطان ابوالحسن کے
پاس پر ہاتھ اٹھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے واپس آکر اس کا دماغ
درست کرنے کی ٹھانی۔ ابوعبداللہ کو شکست ہوئی اور یہ دیوانہ اقتدار پرست بھاگ کر غرناطہ
چلا گیا۔ کچھ دنوں کے لیے سکون ہوا اور مسلمانوں کو دم لینے کی مہلت ملی تو ابوعبداللہ کو
عیسائیوں سے جہاد کا شوق چرایا۔ اس نے فوجیں تیار کر کے لوشنیہ پر حملہ کیا۔ مقابل میں

عیسائی سپہ سالار تجربہ کار جنگ آزما تھا اس نے ابوعبداللہ کو دھوکہ دیا حملہ کے وقت اس کو آگے جانے دیا اور جب یہ لوٹ مار کر کے مالِ غنیمت کے ساتھ واپس ہو رہا تھا تو راستہ میں ایک درہ میں گھات لگا کر چاروں طرف سے گھیر کر حملہ کیا اور اس کے ہمراہیوں میں سے اکثر کو قتل کر کے اس کو گرفتار کرلیا اور بہ صد ذلت و رسوائی فرڈیننڈ کے پاس بھیج دیا۔ یہ خبر سن کر اہلِ غرناطہ نے جو اس کے حریصانہ اور باغیانہ مزاج سے تنگ آئے ہوئے تھے، سکون کا سانس لیا اور سلطان ابوالحسن کے پاس پہنچے کہ غرناطہ کا انتظام سنبھالے اور مسلمانوں کے ہچکیاں لیتے وجود کو عالمِ نزع سے نکالنے کی فکر کرے، لیکن مسلمانوں کے مصائب ابھی ختم نہ ہوئے تھے اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پورے اسپین سے شکست کھا کر محدود رقبے میں محصور ہونے کے باوجود یہ اپنی حالت بدلنے پر تیار نہ تھے۔ تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ رہی تھی اور غرناطہ آخری سانسیں لے رہا تھا، اس وقت بھی وہ منصب و مال کی حرص چھوڑنے اور اتحاد و اتفاق کی خاطر اپنے مفادات کی قربانی دینے پر تیار نہ تھے۔ ان پر عذابِ الٰہی مسلط تھا، ان کے جان و مال کو ہر وقت دشمن سے خطرہ لاحق رہتا تھا، لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی نفسیاتی حالت کو نہ بدلا۔ وہ روتے تھے اور دعائیں مانگتے تھے، تدبیریں اور مشورے کرتے تھے لیکن اپنے مزاجِ بد اور فطرتِ کج کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ سخت مخدوش اور خوفناک حالات کو سامنے دیکھ کر بھی محض اس خاطر وہ اقتدار کی ہوس سے دستبردار ہونے پر تیار نہ تھے کہ عیش و عشرت کے مواقع ہاتھ سے جاتے رہیں گے چنانچہ ہوا یوں کہ سلطان ابوالحسن فالج کے حملے سے معذور ہو گیا، اس نے سلطنت سنبھالنے سے معذرت کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے بھائی کو جو ''الزغل'' کے لقب سے مشہور تھا، تختِ غرناطہ سنبھالنے اور مسلمانوں کو مکمل ہلاکت اور بربادی سے بچانے کی جدوجہد کرنے کا حکم دیا۔

سلطان الزغل میں اپنے آباء واجداد کی خو بو موجود تھی۔ اس نے غرناطہ کی سلطنت ہاتھ آتے ہی ملک کا انتظام درست کرنے اور فوج کی ترتیب پر توجہ دی مگر عیسائی سمجھتے تھے کہ اسے موقع دینا خطرناک ہوگا۔ انہوں نے عظیم الشان لشکر کے ساتھ حملہ کیا اور جنگ کے دوران ایک موقع ایسا آیا کہ وہ سلطان کے خیمے کے قریب پہنچ گئے۔ مسلمانوں نے اپنے امیر کو خطرے میں دیکھ کر خود کو سنبھالا اور پوری ہمت کے ساتھ دشمن پر ایسے حملہ آور ہوئے کہ بہت جلد لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ عیسائی بدحواس ہوکر بھاگے اور ہزاروں لاشیں میدان میں چھوڑ گئے۔ ان حملہ آور عیسائیوں کے پیچھے فرڈینینڈ بذاتِ خود ایک عظیم لشکر لیے چلا آ رہا تھا۔ اس کو جب جنگ کا انجام معلوم ہوا تو آگے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ راستے میں مسلمان آبادیوں پر غصہ نکالتا ہوا اور انہیں تباہ و برباد کرتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس جنگ میں ناکامی پر اسے یقین ہوگیا کہ مسلمان مقدار میں تھوڑے ہی سہی لیکن ان سے میدانِ جنگ میں دوبدو مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں.......... یہ شمشیر بکف میدان میں نکل آئیں تو آج بھی جزیرہ نما اندلس کو عیسائیوں سے لے سکتے ہیں چنانچہ اس نے جنگی سرگرمیوں کو روک کر سیاست و مکاری سے کام لینے کا ارادہ کیا۔ اقتدار کا بھوکا ابوعبداللہ اس کی قید میں تھا۔ اس نے اس کو استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور یہ وہ لمحہ ہے جہاں سے اس داستان کے آخری اور دردناک حصے کا آغاز ہوتا ہے۔

نا اتفاقی کی سزا

فرڈیننڈ اور اس کے مشیر مسلمانوں کے اخلاقی زوال کو تاڑ چکے تھے، اس نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے حکمران اقتدار کو ذمہ داری نہیں عیش پرستی کا بہانہ سمجھتے ہیں اور عوام ملت کی ترقی سے نہیں اپنی خوش حالی سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہر ایک اپنے آپ میں مست ہے اور جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر جلد از جلد وہ تمام فوائد سمیٹ لینا چاہتا ہے جن تک اس کا ہاتھ پہنچ سکے۔ مشکل پڑنے پر یہ میدان میں نکل تو آتے ہیں لیکن سر سے بلا ٹلتے ہی پھر سے اس زندگی کی طرف لوٹ جاتے ہیں جو حرص و ہوس اور عیش و عشرت سے بھرپور ہو۔ ایسی صورت حال میں دشمن کا آدھا کام خود مسلمانوں کے اخلاق باختہ افراد سے نکل آتا ہے اور اسے زیادہ جان کھپانے کی ضرورت نہیں پڑتی چنانچہ فرڈیننڈ نے جنگی کارروائیوں کو روک کر دغا اور فریب سے کام نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہوسِ اقتدار کے مارے ہوئے قیدی حکمران ابوعبداللہ کو قید خانے سے نکالا اور اس کے ساتھ خصوصی اعزاز و اکرام (Red Corpet Protocol) کا معاملہ شروع کر دیا۔ ابوعبداللہ خود کو اس ''عظیم بادشاہ'' کی مجلسوں میں آنے جانے کی اجازت ملتے دیکھ کر اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتا اور فخر و مسرت سے پھولا نہ

سما تا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑے اعزاز کی بات تھی کہ دشمن حکمران اسے اہمیت دیتے ہیں۔ ایک دن فرڈیننڈ باتوں باتوں میں کہنے لگا: ''سلطنت غرناطہ کے اصل وارث تم ہو، تمہارے چچا زغل کا اس پر قبضہ سراسر غاصبانہ ہے، اگر تمہیں اپنا حق لینے میں کسی قسم کی مدد کی ضرورت پیش آئے تو ہمارے جملہ وسائل آپ کے لیے حاضر ہیں۔ دراصل ہم چاہتے ہیں کہ ہم میں اور ہمسایہ مسلم سلطنت میں ہمیشہ خوشگوار تعلقات قائم رہیں کبھی بدامنی یا بدمزگی نہ ہو۔ غرناطہ کا موجودہ حکمران کہنے کو تو مسلمان ہے مگر معاف کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو بدنام کررہا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی ہمدردی نہیں البتہ جس قدر علاقہ اور عوام تمہارے قبضے میں آجائیں، ان سے ہم دوستانہ تعاون کرتے رہیں گے اور کسی قسم کا نقصان ہماری طرف سے انہیں نہ پہنچے گا۔'' ان باتوں نے ابوعبداللہ کے حریص دل میں سوئی ہوئی خواہشِ اقتدار کو پھر سے بیدار کردیا۔ اس کے خیال میں اس کی اور اس سے زیادہ ''مسلمانوں کی فلاح'' اس چیز میں پوشیدہ تھی کہ وہ عیسائیوں کی نظرِ کرم کے سائے میں رہیں۔ وہ اگر اپنے ہم مذہب مسلمان بھائیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا تو وہ اتنے رسوا نہ ہوتے جتنے بعد میں اس کے ہاتھوں ہوئے۔ وہ زغل کی سربراہی میں رفتہ رفتہ استحکام حاصل کررہے تھے لیکن اسے تو ان کی ترقی اور خوش حالی صرف اپنی حکمرانی اور ان منصوبوں میں نظر آتی تھی جو فرڈیننڈ نے اسے ''سبز باغ'' کے حسین گوشے میں لے جاکر دکھائے تھے۔ وہ فرڈیننڈ سے رخصت ہوکر سیدھا مالقہ پہنچا اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ فرڈیننڈ کی تمام تر حمایت اس کے ساتھ ہے اگر وہ اسے حکمران تسلیم کرلیں تو اس کے حملوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں ورنہ زغل کے زیرانتظام علاقوں پر عنقریب قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ بزدلی اور دنیا پرستی کی ماری ہوئی قوم نے ذرا سا بہلانے پھسلانے سے مسلمان امیر کی اطاعت کا عہد توڑ کر دشمن کے ہاں سے مہمانی کھا کر آنے والے ضمیر فروش کا کہنا مان لیا۔ ابوعبداللہ فوراً ہی مسندِ حکمرانی سنبھال

کر اپنا قبضہ مالقہ سے باہر تک وسیع کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوگیا۔

سلطان الزغل کو جب اس کی اطلاع ملی کہ دشمن کی قید سے چھوٹ کر آنے والا ایجنٹ براہِ راست تختِ مالقہ پر متمکن ہو چکا ہے تو وہ اس کی بغاوت کے خاتمے کے لیے غرناطہ سے نکلا مگر اسے راستے میں ہی احساس ہوگیا کہ اس مرتبہ عیسائیوں نے زیرِ زمین تیاریوں میں کسر نہیں چھوڑی ہے۔ اس نے دیکھا اندلس کے تمام عیسائی بیک زبان ابوعبداللہ کم بخت کے ساتھ ہیں اور اسلامی لشکر کے خلاف ہر طرح کی کارروائی پر پوری طرح آمادہ ہیں۔ غرناطہ کے قریبی مقام بیزین کے عیسائی اپنے منظورِ نظر حکمران کی حمایت اور مدد میں سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، چنانچہ وہ الٹے قدموں واپس غرناطہ آ گیا اور مالقہ اور اس کے نام نہاد مسلمان باشندوں کو جنھوں نے خود ہی عیسائی ایجنٹ کو اپنا فرمانروا تسلیم کرلیا تھا، اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اب ابوعبداللہ کی باری تھی۔ اس نے سلطان زغل کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر لوشہ نامی مقام میرے حوالے کردو تو میں آپ کے ساتھ مل کر فرڈیننڈ کے خلاف صف آرا ہو جاؤں گا۔ اب اس مطالبہ میں جتنی معقولیت تھی وہ ظاہر ہے لیکن سلطان الزغل کے کئی ماتحت سردار اور عوام اس پر مائل ہو گئے کہ ایسا کرنے میں کیا حرج ہے؟ بداعمالیوں اور شہوت پرستیوں کے سبب اچھے اچھوں کی مت ماری گئی تھی چنانچہ ادھر لوشہ پر (آج کل یہ اسپین کا صوبہ ہے اور اسے لوجا کہتے ہیں) ابوعبداللہ کا قبضہ ہوا۔ ادھر اس نے فرڈیننڈ کو بلا بھیجا اور خود اس کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ لوشہ دفاعی لحاظ سے سلطنت غرناطہ کا نہایت اہم حصہ تھا اور فرڈیننڈ کئی سال کی کوششوں کے باوجود اس کو بزورِ شمشیر حاصل نہ کرسکا تھا مگر آج مسلمانوں کی اندلس میں ہچکولے کھاتی سلطنت کا یہ دفاعی مورچہ فردِ واحد کی حماقت سے بغیر کسی خونریزی کے اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔ مؤرخین نے اس حادثے کی تاریخ جمادی الثانیہ 891ھ لکھی ہے۔

اب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے دیکھا کہ باغی شہزادہ تو ہم سے وعدے کچھ کرتا ہے اور عملاً کچھ اور کرتا جا رہا ہے۔ وہ شہر اور قلعے جو عیسائی ان سے سالہا سال تک لڑ کر حاصل نہ کر سکے تھے، اس نے چند دن میں ان کے حوالے کر دیے ہیں۔ ان کو ہوش آیا مگر قدرت ان کو موقع دینے پر تیار معلوم نہ ہوتی تھی۔ دراصل جو قوم فکری طور پر صحیح اور غلط کا فیصلہ کرتے وقت اس معیار اور کسوٹی پر عمل نہ کرے جو حق و باطل کے امتیاز کے لیے ہے تو بعد میں نقصانات کے ذریعے درست و غلط کی پہچان اسے کوئی فائدہ نہیں دیتی کیونکہ وہ تو اپنے نفع و نقصان کو دیکھ کر چلنے والی بن جاتی ہے، صحیح اور غلط کی اس کو چنداں فکر نہیں ہوتی، اس لیے قدرت بھی اس کی فکر چھوڑ دیتی ہے۔ ابوعبداللہ اب غرناطہ کے قریب عیسائی آبادی میں بیٹھ کر غرناطہ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ عیسائی اس کے راستے میں پلکیں بچھاتے تھے اور وہ خود کو مستقبل میں اُندلس کے ایسے حکمران کے روپ میں دیکھ رہا تھا جسے عیسائیوں کی حمایت حاصل تھی اور جو بے خوف و خطر طویل عرصے تک اس سرسبز سلطنت کی حکمرانی کے مزے لوٹ سکتا تھا۔ ادھر اس کی ریشہ دوانیاں جاری تھیں اُدھر مالقہ کے باشندوں نے عیسائیوں کے خلاف بغاوت اور سلطان الزغل کی اطاعت کا ارادہ کر کے عیسائی حکومت کی ظاہری علامات و نشانات کو مٹا دیا۔ یہ سن کر فرڈینینڈ جو رواداری اور محبت کی باتیں کرتے نہ تھکتا تھا فوراً اپنے اصل روپ میں آ گیا اور عظیم الشان لشکر لے کر جس کی قیادت وہ خود کر رہا تھا، مالقہ کا محاصرہ کر لیا۔ ساحل کی طرف سے جنگی جہاز بھی آ پہنچے اور اہل مالقہ محصور ہو گئے۔ سلطان الزغل ان کی اطاعت کا عہد سن چکا تھا۔ باوجود مشکلات کے وہ ان کی امداد کو نکلا مگر ابھی وہ راستے میں تھا کہ ابوعبداللہ موقع پا کر اور غرناطہ کو خالی دیکھ کر اس پر قابض ہو گیا۔ سلطان الزغل یہ وحشتناک خبر سن کر واپس لوٹا مگر راستے میں یہ سن کر کہ غرناطہ پر ہونہار شہزادے کا قبضہ مکمل ہو چکا ہے ایک وادی میں ٹھہر گیا جسے مؤرخین نے وادی آش کے نام سے یاد کیا ہے۔

اس دن مسلمانوں کی بدبختی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ چاروں طرف سے عیسائیوں میں گھرے ہوئے تھے لیکن ان کی آپس کی نااتفاقی اور دنیا پرستی کسی حد و انتہا پر نہ ٹھہرتی تھی۔ وہ نیک و بد کی تمیز کے بغیر ہر اس حکمران کے ساتھ ہو جاتے تھے جو ان کے سامنے ہاتھ لہراتا تھا۔ اگرچہ غرناطہ کے مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ابوعبداللہ نے آج تک کیا کیا ہے؟ اور سلطان الزغل کس غرض اور کس مشکل حالات میں مالقہ کے مسلمانوں کی مدد کے لیے غرناطہ سے نکلا ہے مگر اس کے باوجود انہوں نے ابوعبداللہ کا تختِ غرناطہ پر وجود تسلیم کرلیا اور فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے اس کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ اہل مالقہ اب فرڈیننڈ کے حصار میں تھے اور ان کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے والا غرناطہ پر حکمران بن چکا تھا۔ حسبِ دستور غرناطہ کے ''جمہور عوام'' اس کے ساتھ ہو گئے تھے اور اس کی ذات شاعروں کے قصیدوں اور دانشوروں کی مدح کا مرکزی موضوع بنی ہوئی تھی۔ اہل مالقہ نے ہر طرف سے مایوس ہو کر مراکش، تیونس، مصر اور ترکی کے مسلم حکمرانوں سے مدد کی التجا کی۔ ان ممالک کے مجاہد اس سے قبل بھی کئی مرتبہ ہسپانیہ کے مسلمانوں کی امداد کو آچکے تھے مگر ہسپانوی مسلمانوں کے اخلاق اتنے بگڑ چکے تھے کہ عیسائیوں کا خطرہ ٹلتے ہی وہ اپنے ان مددگاروں کے بھی مخالف ہو جاتے تھے لہٰذا اس مرتبہ کوئی ان بے بسوں کی مدد کو نہ آیا۔ ان دنوں سلطنتِ عثمانیہ کا فرمانروا سلطان محمد فاتح کا بیٹا سلطان بایزید ثانی تھا۔ یہ ایسا عجیب انسان تھا کہ اس نے اپنے عظیم باپ کے فتح کئے ہوئے کچھ یورپی علاقے بھی واپس دے دیے تھے۔ یہ مالقہ والوں کی مدد کو کیا پہنچتا؟ ہر طرف سے مایوس ہو کر اہل مالقہ نے فرڈیننڈ سے صلح کی درخواست کی۔ یہ ان کی بے بسی اور شامتِ اعمال کی انتہا تھی کہ کل وہ جس کے بھیجے ہوئے نمائندے کو نجات دہندہ سمجھ کر ناجائز طور پر اپنا حکمران تسلیم کر رہے تھے آج اس سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے مگر اس کا جواب تھا: ''اب تمہارے پاس سامانِ رسد ختم ہو چکا ہے اور تم ہر

طرف سے مایوس ہو چکے ہو لہٰذا بغیر کسی شرط کے شہر کی چابیاں ہمارے پاس بھیج دو۔"

اہلِ مالقہ کی سادگی دیکھئے کہ انہیں اب بھی اس سے رحم وکرم کی امید تھی۔ فرڈیننڈ نے شہر پر قابض ہوتے ہی تمام مسلمانوں کو قید کر کے غلام بنالیا، سب کی اموال و جائیداد ضبط کر لی اور شہر کے بقیہ باشندوں کو افریقہ کی طرف جلاوطن کر دیا۔ ان لوگوں کو اپنے ساتھ کسی قسم کا سامان لے جانے کی اجازت نہ تھی لہٰذا بے سروسامانی کی حالت میں نکلنے والے ان مسلمانوں کی اکثریت راستے میں ختم ہوگئی۔ فرڈیننڈ اور اس کی جنونی بیوی ازابیلا نے گردونواح کے تمام مسلمان قصبوں اور قلعوں کی مسلم آبادی کو بھی قتل یا جلاوطن کیا اور اس کے بعد ایک ایک شہر اور ایک ایک قلعہ کو فتح کرتے ہوئے وادی آش کی طرف بڑھے جہاں سلطان الزغل مقیم تھا۔ سلطان میں اس کے مقابلے کی تاب نہ رہی تھی، آش اس نے جنگ کی ہمت نہ کی اور علاقہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد فرڈیننڈ نے قلعہ المریہ پر قبضہ کیا جو غرناطہ کا آخری دفاعی مورچہ تھا۔ (دیکھئے منسلکہ تصویر) اور پھر اندلس کی مسلم سلطنت غرناطہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ جس وقت اہلِ غرناطہ پر زمین تنگ ہو کر سکڑ رہی تھی ابوعبداللہ قصر الحمراء کے بالا خانوں میں مصاحبوں اور مشیروں کے ساتھ بیٹھا اپنے چچا سلطان الزغل کی تباہی اور بدانجامی کا حال سن سن کر خوش ہو رہا تھا کہ اب اس کے قبضے میں کوئی جگہ نہیں رہی لہٰذا اب تنہا میری حکومت قائم رہے گی جسے عیسائیوں کی حمایت اور خوشگوار تعلقات کا اعزاز بھی حاصل ہوگا کہ اچانک اسے فرڈیننڈ کا یہ خط پہنچا: "تمہارے چچا سلطان الزغل نے اپنا سارا ملک میرے حوالے کر دیا ہے لہٰذا تم بھی غرناطہ اور قصرِ الحمراء میرے حوالے کر دو۔"

آخری مورچہ

ابوعبداللہ کو جب یہ تحریر پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی قوم سے بے وفائی اور غیروں سے آشنائی کر کے خود پر اور اُندلس کے تمام مسلمانوں پر کیا ظلم ڈھایا ہے۔ اس نے فرڈیننڈ کے لیے جو کام کیے وہ اور کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن جتنا کام اس سے لیا جا سکتا تھا اس کے پورا ہوتے ہی عیسائیوں نے اسے اپنی دوستی اور وفاداری کی حقیقت جتلا دی تھی۔ اس موقع پر اسے اپنے عوام یاد آئے، اس نے اہلِ شہر کو جمع کر کے فرڈیننڈ کا خط سنایا کہ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، غرناطہ اور قصر الحمراء عیسائیوں کے سپرد کر دیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ اہلِ غرناطہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ سارا وبال اسی شخص کی غداریوں اور نالائقیوں کے سبب آیا ہے اور اس نے محض اپنے اقتدار کی خاطر دشمنوں سے تعلقات بڑھا کر اندلس کی حکومت کو برباد کیا ہے اور آج سے پہلے کئی مرتبہ کی تنبیہ کے باوجود اس نے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو اپنی والدہ (اس کی والدہ اس کی حرکتوں سے نالاں رہتی تھی اور اندلس چھوڑتے وقت اس نے چند تاریخی جملے کہے تھے جو آگے آئیں گے) کے کہنے پر بھی ملحوظ نہیں رکھا مگر اس حالت میں ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ

مل کر عیسائیوں سے جنگ کریں چنانچہ سب نے رائے دی کہ جنگ کے چیلنج کو منظور کر لینا چاہیے۔ ابوعبداللہ نے عیسائیوں سے اس قدر یارانہ گانٹھ رکھا تھا اور اتنے مواقع پر ان کی امداد قبول کر کے ان کے ساتھ مل کر اپنے والد اور چچا کے خلاف لڑا تھا کہ اب اس سے ان کے مقابلے میں تلوار اٹھائی نہ جاتی تھی مگر سب کو جنگ پر تیار دیکھ کر اس نے بھی حامی بھر لی۔ ابھی یہاں مشورے ہو رہے تھے اور کوئی جواب فرڈیننڈ کو نہیں بھیجا گیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں میں اتنا دم خم ہے کہ وہ مفت میں اسے شہر حوالے کرنے کی بجائے لڑ کر مرنے کو ترجیح دیں گے، لہٰذا کچھ جواب ملنے سے پہلے ہی فوجیں لے کر غرناطہ کے محاصرے کو آ پہنچا۔ اہلِ غرناطہ کچھ بھی تھے لیکن ان کی رگوں میں ان کے بہادر اور اولوالعزم آباء واجداد کا خون دوڑ رہا تھا۔ اگرچہ سیاست، گروہ بندی اور مال و زر کی افراط نے انہیں قسما قسم اخلاقی امراض میں مبتلا کر دیا تھا، ان مشکل دنوں میں بھی وہ غرناطہ کے باغوں میں فواروں کے کنارے سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ کر شعر و شاعری کرتے یا فنونِ لطیفہ پر تبادلہ خیال کرتے تھے.......... لیکن بہر حال تھے وہ اہلِ ایمان اور ان کے دل میں ایمان کی چنگاری کو بڑھک کر شعلہ بنتے دیر نہ لگتی تھی چنانچہ یہی ہوا۔ ان سب نے مقابلہ پر کمر ہمت باندھ لی اور اس بے جگری سے حملہ آور افواج کو جواب دیا کہ ان کے دانت کھٹے کر دیے۔ فرڈیننڈ نے ان کی مزاحمت کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ غرناطہ کا آخری مورچہ فتح کرنے کے لیے مزید تیاریوں اور سازشوں کی ضرورت ہے، اس وقت یہاں پڑے رہنے سے بے فائدہ جانی و مالی نقصان ہوگا چنانچہ وہ اس آخری مہم کو مناسب وقت تک ملتوی کر کے فوجیں لے کر واپس چلا گیا۔ اہلِ غرناطہ نے آگے بڑھ کر وہ تمام علاقے اور قلعے واپس لے لیے جو عیسائیوں نے چھینے تھے۔ ان میں البشرات نامی علاقہ بھی تھا وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کی اور ازسرِ نو اس پورے خطے میں اسلامی حکومت جاری ہوگئی۔ مسلمان اگرچہ

قلیل تعداد میں تھے لیکن اس فتح سے ان کے حوصلے بلند ہو گئے اور انہوں نے پامردی اور جواں ہمتی سے کام لیتے ہوئے اردگرد کے علاقے کا تصفیہ کرنا شروع کیا۔ قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ کی رُو سے یہ وہ وقت تھا جب گرتا ہوا انسان سنبھل جاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیتا ہے۔ اہلِ غرناطہ اس دور سے گزر رہے تھے جس میں وہ اپنے وجود کو چمٹنے والے اخلاقی امراض سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کرتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کی کایا پلٹ جاتی لیکن اس نازک موقع پر انہیں پھر ایسی چوٹ لگ گئی جس سے بچنا مریض کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔

ہوا یوں کہ ابوعبداللہ کا چچا الزغل جس سے غداری اور بغاوت کر کے ابوعبداللہ نے غرناطہ کی سلطنت چھینی تھی البشرات کے ایک گاؤں میں مقیم تھا۔ اس سے ابوعبداللہ کی سربراہی میں اہلِ غرناطہ کی کامیابی دیکھی نہ گئی، اس نے فرڈیننڈ کو اطلاع دی کہ ابوعبداللہ اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ اگر اس کی طرف سے کچھ عرصہ بے توجہی کی گئی تو پھر اسے روکنا مشکل ہو جائے گا۔ فرڈیننڈ کو زغل کا یہ خیال صحیح معلوم ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ اہلِ غرناطہ میں حالات کی سنگینی کے سبب ایسی روح بھر گئی تھی کہ انہیں تھوڑی سی مہلت مزید مل جاتی تو ان کی رفتار اور طاقت کو سنبھالنا دشمن کے بس کی بات نہ رہتی۔ اس موقع پر معزول سلطان الزغل کو چاہیے تھا کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے ذاتی رنجشوں اور رقابتوں کو فراموش کر دیتا اور درگزر سے کام لے کر مسلمانوں کی ترقی کی راہ کھوٹی نہ کرتا لیکن وہ اپنے نفس اور حسد پر قابو نہ پا سکا حالانکہ وہ ایسا کر لیتا تو آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی اس کا فائدہ اسی کو ہوتا۔ فرڈیننڈ اتنی جلدی دوبارہ جنگ کے لیے نہ آ سکتا تھا مگر الزغل نے اپنی خدمات پیش کیں اور اس کو لکھا کہ اگر اسے عیسائی افواج اور باشندوں کا تعاون حاصل ہو جائے تو وہ اس ''فتنے'' کو قابو کر سکتا ہے۔ پھر وہ خود المیریہ پہنچا۔ یعنی وہی تاریخی قلعہ جو ابوعبداللہ کی غداری کے سبب

الزغل سے چھنا تھا، اب الزغل وہاں سے امداد لے کر ابوعبداللہ سے غرناطہ چھین لینا چاہتا تھا۔ اس وقت دونوں میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ اُندلس کے مسلمانوں کے لیے وہی نجات دہندہ ہے اور دوسرا ان کے لیے وبال ہے۔ لہٰذا دونوں مسلمان اندلس کی ''ترقی اور نجات'' کے لیے اپنے آپ کو غرناطہ تخت پر پہنچانا چاہتے تھے۔ 895ھ وہ سال تھا (سقوطِ غرناطہ سے ایک سال پہلے) جب زغل نے ماہِ رمضان میں (جی ہاں! ماہِ رمضان کا مسلمانوں میں اب بس یہی احترام رہ گیا تھا کہ عیسائیوں کی مدد سے مسلمانوں کی ترقی کے لیے راہیں ڈھونڈیں) عیسائی اتحادیوں کی مدد سے وہ علاقے اہلِ غرناطہ سے لے لیے جو غرناطہ کے دفاع کو مضبوط کرنے کی خاطر عیسائیوں سے چھینے گئے تھے۔ مسلمانوں کی بداعمالی نے ان کو پھر دربدر کر دیا اور یہ علاقے عیسائیوں کے پاس جاتے ہی 13 شوال 895ھ کو فرڈیننڈ اپنی تازہ دم فوجیں لیے آ پہنچا اور علاقے میں مسلمانوں کا قتل عام برپا کر کے ان کے مضبوط قلعے گرا کر زمین سے برابر کر دیے۔ غرناطہ کے گرد و پیش میں ایک شخص بھی اللہ کا نام لینے والا نہ رہا۔ اس قتلِ عام کے بعد جو الزغل کی اعلیٰ خدمات کے سبب فرڈیننڈ کے لیے ممکن ہوا تھا، عیسائی لشکر آخری تیاری کے لیے واپس ہو گیا۔ جاتے جاتے فرڈیننڈ نے الزغل کو بلا کر جو حکم دیا وہ ان تاریخی کلمات میں سے ہے جو اپنے اندر معنی کی پوری دنیا رکھتے ہیں لیکن افسوس ان میں کوئی غور نہیں کرتا۔ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے اپنی تاریخ میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ فرڈیننڈ نے الزغل کی خدمات کا صلہ دیتے ہوئے فرمان سنایا: ''اب آپ کی اس ملک میں کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم آپ پر صرف اس قدر احسان کر سکتے ہیں کہ اگر آپ اس ملک (یعنی جزیرہ نمائے اُندلس) سے کہیں باہر جانا چاہیں تو ہم آپ کو جانے دیں گے۔''

زغل نے جتنی بدبختی مول لینی تھی وہ اسے سمیٹ چکا تھا چنانچہ اپنی بے برکت زندگی

کے آخری دن جلاوطنی میں گزارنے کو ہی اس نے غنیمت سمجھا اور یہ حکم سنتے ہی (حکم واپس لیے جانے یا بدلنے کے خوف سے) جلد اندلس سے روانہ ہوکر افریقہ کے شہر تلمسان پہنچا اور باقی دن گمنامی کی حالت میں بسر کر دیے۔ فرڈیننڈ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں نے تازہ زخم کھایا ہے اس وقت وہ بپھرے ہوئے ہیں، ان کو چھیڑنا مناسب نہیں لہٰذا اپنی فوجیں لے کر واپس چلا گیا۔ اہلِ غرناطہ نے پیش قدمی کر کے برشلونہ فتح کر لیا لیکن عیسائیوں نے متحد ہوکر اسے مسلمانوں سے چھڑا لیا اور وہاں کسی مسلمان کو زندہ نہ چھوڑا۔ اہل غرناطہ تعداد کی کمی، حکمرانوں کی نالائقی اور کاموں کی کثرت کی وجہ سے تنگ آ گئے تھے، ان کی مایوسی اور افسردگی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ جہاں قدم بڑھاتے کسی نامبارک کے کرتوتوں کی وجہ سے پھر پیچھے آنا پڑتا، مسلمانوں کے قتل اور جلاوطنی کے حالات پورے اُندلس سے سننے میں آتے رہتے اور مسلم ممالک سے امداد آنے کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔

تاریخِ اسلام کا اَلمناک دن

879ھ مطابق 1491ء کے موسم گرما میں فرڈینینڈ اور اس کی جنونی ملکہ ازابیلا اپنے لشکرِ جرار کے ساتھ جس میں فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کثیر تعداد میں پادری بھی شامل تھے، غرناطہ پر فیصلہ کن حملے کے لیے آ پہنچے۔ غرناطہ کے مضافات میں پہنچتے ہی انہوں نے اس سرسبز و شاداب علاقے کے کھیتوں اور باغوں کو جلانا اور ادھر ادھر اِکّا دُکّا رہنے والے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کردیا اور اپنے پرانے دوست اور وفادار خادم ابوعبداللہ کو پیغام بھجوایا: ''اگر تم نے ہتھیار نہ ڈالے تو غرناطہ کی آبادی کو تہہ تیغ کر کے الحمرا سمیت پورے غرناطہ کو جلا کر راکھ کر دیا جائے گا۔'' اس وقت پوری سرزمینِ اندلس میں صرف سلطنتِ غرناطہ مسلمانوں کے پاس باقی رہ گئی تھی، لہٰذا یہاں کے مسلمان موت و زندگی کی آخری جنگ لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ عیسائی فوجوں کا محاصرہ آٹھ مہینے تک مسلسل جاری رہا لیکن اس میں انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی کیونکہ شہر کے ایک طرف کوہِ شیلر نامی پہاڑ واقع تھا جہاں سے عیسائی فوجیں محاصرہ نہ کرسکتی تھیں اور مسلمانوں کو اس راستے سے امداد پہنچتی رہتی تھی، البتہ موسم سرما میں جب برف باری شروع ہوئی اور پہاڑی

راستوں کے ذریعے امداد کی ترسیل ناممکن ہوگئی تو اہلِ شہر میں بے چینی و اضطراب بڑھا۔ انہوں نے اس موقع پر دلیرانہ فیصلہ کرتے ہوئے طے کیا کہ اگر فرڈیننڈ کو ہمارے ہتھیار چاہییں تو اسے خود آ کر ہم سے لے جانے ہوں گے۔ ہم عیسائیوں کے محاصرے میں بھوکوں مرنے کے بجائے میدانِ جنگ میں جان دیں گے اور جب تک جسم میں جان ہے مقابلہ سے منہ نہ موڑیں گے۔ ان سب نے ابوعبداللہ سے درخواست کی کہ ہماری تعداد جو اس وقت محصور ہے اگر چہ 20 ہزار سے کم ہے اور محاصرین ایک لاکھ سے زائد ہیں، مگر ہمیں اندلس کے فاتح اول امیر طارق بن زیاد اور اس کے ساتھیوں کا معرکہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے جنہوں نے مٹھی بھر ہوتے ہوئے بھی ایک لاکھ کے لشکر کو شکستِ فاش دی تھی لہٰذا ہمیں بھی جرأت پر مصلحت پرستی کو غالب نہ آنے دینا چاہیے۔ ان بہادر مسلمانوں نے یہ طریقہ شروع کیا کہ ہر روز قلعے سے ایک مسلمان شہسوار تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے نکلتا اور عیسائی افواج کے سامنے پہنچ کر انہیں دو بدو مقابلے کی دعوت دیتا۔ کئی دنوں تک ایسا ہوتا رہا کہ مقابلے پر نکلنے والا عیسائی سورما ہلاک ہو جاتا اور مسلمان شہسوار فاتح بن کر قلعہ کو لوٹ جاتا۔ جب بہت سے عیسائی سالار انفرادی مقابلوں میں مارے گئے تو فرڈیننڈ نے مسلمانوں کے چیلنج کا جواب دینے پر پابندی لگادی۔

لیکن ابوعبداللہ ایسا نامبارک شخص تھا کہ نحوست اور بے برکتی ان دنوں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ اہلِ شہر لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں اور جنگ یا صلح کا جلد فیصلہ نہ ہوا تو خود سے کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں جو اس کی ''عظیم حکمرانی'' اور ملکی نظم وضبط کے خلاف ہو، تو اس نے اپنے وزراء اور امراء کی مجلسِ مشاورت قصرِ الحمرا میں طلب کی۔ عمائدینِ شہر کو بھی اس میں شریک کیا گیا۔ مجلس کا آغاز ہوا تو اپنے آپ کو بزورِ تختِ غرناطہ پر مسلط کرنے اور اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھنے والے اس حکمران کا حوصلہ ایسا پست ہو گیا تھا کہ

ان چند الفاظ کے سوا اس کے منہ سے کوئی جملہ نہ نکلتا تھا: ''عیسائی جب تک شہر پر قبضہ نہ کر لیں گے محاصرہ نہ اٹھائیں گے، ایسے نازک وقت میں کیا تدبیر کی جائے؟'' یعنی یہ کم ہمت شخص مشورہ طلب کرنے سے پہلے حاضرین کو ڈرانا ضروری سمجھتا تھا تاکہ وہ ''مناسب'' مشورہ دیں۔ وزراء وامراء اس کی طرح نااہل اور عیش پسند تھے، ان کے حوصلے ان کے جسموں سے زیادہ ناکارہ ہو چکے تھے۔ انہیں غلامی کا ذلت ناک طوق سامنے نظر آتا تھا پھر بھی وہ زندگی کے پیالے سے بھیک کی چند مزید ساعتیں حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ ان میں سے اکثر نے رائے دی کہ حملہ آوروں سے صلح کر لینی چاہیے۔ غرناطہ کے بہادر سپہ سالار موسیٰ بن ابی الغسان سے یہ نامردی اور بزدلی برداشت نہ ہوئی۔ وہ جوش میں آ کر کھڑا ہو گیا اور ان مردہ دلوں کو غیرت دلانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا: ''ابھی تک کامیابی کی امید باقی ہے۔ ہمیں ہرگز ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور آخری وقت تک مقابلہ کرنا چاہیے، مجھ کو امید ہے ہم ان عیسائیوں کا محاصرہ ناکام کر کے ان کو بھگا دیں گے۔'' غرناطہ کے عام مسلمان باشندوں کی بھی یہی رائے تھی مگر ان کی لگام جن ہاتھوں میں تھی وہ مفلوج اور ناکارہ ہو چکے تھے۔ پُرعزم سپہ سالار کی رائے سے کسی نے اتفاق نہ کیا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر ہم جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے تو حملہ آور ایک مسلمان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ یہ درباری وزیر موت کو دانشورانہ تدبیروں سے ٹالنا چاہتے تھے جبکہ حیلوں بہانوں سے موت کبھی ٹلی ہے نہ بزدلانہ تدبیریں اس کا راستہ روک سکی ہیں۔ فوج اور عوام کے جنگ پر اصرار کے باوجود غرناطہ کے نالائق حکمران اور اس کے خوشامدی درباریوں نے عوام سے بڑھ کر عوام کے خیر خواہ بنتے ہوئے فیصلہ کیا کہ ایسی شرائط پر صلح کر لی جائے جس سے عوام کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ان کو سامنے نظر آتا تھا کہ عیسائی حملہ آور اندلس سے مسلمانوں کا یکسر خاتمہ چاہتے ہیں، آج تک ان کا جہاں بس چلا انہوں نے ایک مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا مگر پھر بھی اندلس کے

مسلم عوام کا وسیع تر مفاد ان کو اسی میں نظر آتا تھا کہ ان کی خواہش کے برخلاف شہر محاصرین کے حوالے کر کے جان کی امان حاصل کی جائے۔

بدعمل اور بدنصیب ابوعبداللہ آج تک کسی معاملے میں اندلس کے مسلمانوں کی درست نمایندگی نہ کر سکا تھا مگر پھر بھی وہ خود کو ان کا واحد جائز حکمران سمجھتے ہوئے اپنے فیصلوں میں ان کی نجات پوشیدہ ہونے پر مُصر تھا۔ اس نے جب محسوس کیا کہ عوام اس کے فیصلے سے ناخوش ہیں اور کسی وقت بھی بغاوت ہو سکتی ہے تو اپنے وزیر ابوالقاسم عبدالملک کو خفیہ طور پر فرڈینڈ کے پاس بھیجا۔ عیسائی افواج اور ان کا سالار قلعہ والوں کی پتلی حالت سے بے خبر تھے اور آٹھ ماہ گزرنے کے بعد بھی اب تک مسلمانوں کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکنے کے سبب نہایت بددل اور بیزار ہو چکے تھے۔ وزیر کے پہنچنے اور صلح پر آمادگی ظاہر کرنے پر سارے لشکر میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ صلح کے اس نامہ و پیام کو غرناطہ کے باشندوں سے چھپانے کی خاطر یہ وزیر رات کو قلعے سے باہر جاتا اور شب کی اندھیریوں میں وہ شرائط صلح طے پاتیں جنھوں نے آج غرناطہ کو ہر مسلمان کے دل کا رِستا زخم بنا دیا ہے۔ ابوعبداللہ اور اس کے مصاحبین نے بزعم خود ان شرائط کو نہایت ذہانت سے ترتیب دیا تھا مگر عیسائیوں نے اپنا داؤ چلنے کے بعد ایک کا بھی خیال نہ رکھا اور متعصب دشمن سے رحم کی امید رکھنے والے خوش فہموں کی ساری تدبیریں اور ذہانت دھری کی دھری رہ گئیں۔

اس معاہدے پر یکم ربیع الاول 897ھ مطابق 2 جنوری 1492ء کو دستخط ہوئے تھے اور 60 روز میں عملدرآمد ہونا طے پایا تھا مگر یہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی 12 ربیع الاول 897ھ کو اسے شہر عیسائیوں کے سپرد کرنا پڑ گیا۔ ہوا یوں کہ غرناطہ کے باشندوں کی قسمت پر غلامی کی مُہر لگانے والا یہ معاہدہ چھپا نہ رہ سکا اور جب عوام اور فوج میں اس کی خبر پھیلی تو وہ نہایت رنجیدہ اور بددل ہوئے کہ ابوعبداللہ نے زور آزمائی کے بغیر مفت میں پورا

ملک ان عیسائیوں کی زبان پر اعتماد کر کے حوالے کر دیا جنہوں نے خود اس کو استعمال کرنے کے بعد محصور کیا تھا۔ اس کے خلاف ہر طرف سے اتنی آوازیں اٹھنے لگ گئیں کہ اسے خطرہ ہوا کہ شہر والے بغاوت کر کے بنا بنایا کام نہ بگاڑ دیں۔ اس نے بجائے اس کے کہ شہر والوں کے حوصلے اور جنگ آزمائی سے فائدہ اٹھاتا یا کم از کم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا، محض اپنی جان بچانے کے لیے مقررہ وقت سے پہلے ہی شہر کی چابیاں فرڈیننڈ کے حوالے کر دیں۔ یہ تاریخِ اسلام کا وہ المناک دن تھا جب غرناطہ کے نااہل حکمران نے اپنے آباء و اجداد کی روایت کے برخلاف لڑ کر فتح حاصل کرنے یا عزت سے مرنے کا فیصلہ کرنے کی بجائے ذلت سے جی کر رسوائی سے مرنے کو ترجیح دی۔ غرناطہ کا جری سپہ سالار موسیٰ بن ابی الغسان یہ ذلت سہنے پر آمادہ نہ تھا۔ شہر کی چابیاں سپرد کیے جانے سے ایک رات پہلے وہ اسلحہ پہن کر قلعہ سے نکلا اور تن تنہا دشمن کا لشکر چیرتے ہوئے دریائے شنیل کی طرف نکل گیا۔ دنیا غرناطہ کے اس آخری شہید کو آج تک سلام کرتی اور جاں بخشی کی درخواست کرنے والوں پر آج تک نفرین بھیجتی ہے۔

اگلے دن ابوعبداللہ ظہر کی نماز کے بعد اپنے 50 ساتھیوں کے ہمراہ الحمراء کے باب الجد ور سے نکل کر اس مسجد کے پاس گیا جو آج سان سباستیان کے نام سے جانی جاتی ہے۔ معاہدے کی رو سے یہاں عیسائی تاجدار اور اس کی افواج ابوعبداللہ کا انتظار کر رہی تھیں۔ ابو عبداللہ نے کنجیاں فرڈیننڈ کے حوالے کر دیں۔ فرڈیننڈ نے یہ چابیاں اپنی ملکہ کو دیں، ملکہ نے انہیں ولی عہد کی طرف پھینک دیا، ولی عہد نے انہیں سپہ سالار ماؤنٹ ٹیوڈلا کے سپرد کیا اور پھر اندلس کے سب سے بڑے پادری کو حکم ہوا کہ وہ سب سے پہلے شہر میں داخل ہو اور قلعہ الحمراء کے سب سے بڑے برج پر آٹھ سو چھ برس سے سربلند اسلامی جھنڈے اور نشان کو گرا کر صلیب نصب کرے۔ غرناطہ کے ہر گھر سے آتی ہوئی آہوں اور سسکیوں کی

آوازیں دلوں کو چھید رہی تھیں۔ پادری الحمراء کی روشوں پر بڑھتا گیا اور برج الحراستہ نامی ٹاور پر جا پہنچا۔ جونہی صلیب بلند ہوئی نیچے میدان میں منتظر فرڈینڈ اور اس کی افواج زمین پر گر گئے اور مقدس مریم کی شان میں نغمے گانے لگے۔ غرناطہ کے گھروں کے دروازے بند تھے۔ ان کے مکین گریہ و آہ وزاری سے نڈھال تھے اور شہر پر ایسی وحشت اور المناک اداسی چھائی ہوئی تھی جس کا تصور آج بھی دلوں کو پگھلائے دیتا ہے بشرطیکہ ان میں ایمان ہو۔

مور کی آخری آہ

ابوعبداللہ آخری کارنامہ انجام دے کر کوہ البشارات (ALPUXARRAS، اندلس کا حسین ترین پہاڑی سلسلہ) کی طرف رخصت ہوگیا۔ اتنے میں چاندی کی صلیب قصر الحمراء کے برج پر بلند ہوکر آفتاب کی شعاعوں میں چمکنے لگی اور عیسائی بادشاہ فاتحانہ قصر الحمراء میں داخل ہوا۔ عیسائیوں کی خوشی ومسرت اور مسلمانوں کے غم ورنج کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک عاقبت نااندیش نااہل شخص نے صدیوں قدیم عظیم ورثہ کو جاں بخشی کی امید اور عیسایوں کے وعدے پر اعتماد کر کے لڑے بغیر ان لوگوں کے حوالے کردیا تھا جن کے وعدوں کی سچائی کا خود اس کو بھی بارہا تجربہ ہوچکا تھا۔ ''إن الله لا یظلم الناس شیئا ولکن الناس أنفسهم یظلمون.'' غرناطہ سے نکل کر قریبی پہاڑی کی ایک چوٹی پر پہنچ کر ابو عبداللہ نے بے اختیار مڑ کر اس عظیم ورثے کی طرف دیکھا جو اس نے اپنی نالائقیوں سے دشمن کے حوالے کیا تھا تو بے ساختہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی ماں نے جب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو غصے اور نفرت سے کہا: ''جس چیز کی تم مردوں کی طرح حفاظت نہیں کرسکے اس کے چھن جانے پر عورتوں کی طرح آنسو بہانے کا کیا فائدہ؟'' اس

مقام کو جہاں ابوعبداللہ کی سرد آہ نکلی تھی بے چارگی اور شکست کی علامت کے طور پر ''مور کی آخری آہ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ (لفظ مور عمومی معنی میں اسپین کے سبھی مسلمانوں کے لیے بولا جاتا ہے مگر یہ صحیح نہیں، صحیح معنیٰ میں مور شمالی افریقہ سے آئے ہوئے بربر قبائل کے مسلمانوں کو کہا جاتا ہے اور عربوں کو ساراسین [1](SARACENS) شرقیین کی بگڑی ہوئی شکل) کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے موسیٰ بن نصیر ساراسین تھے اور طارق بن زیاد مور۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

علامہ مقریزی نے اندلس پر اپنی شہرۂ آفاق تاریخ میں لکھا ہے: ''جس وقت میں فاس (مراکش کا مشہور تاریخی شہر) میں اپنی تاریخ لکھ رہا تھا (یہ 1534ء کی بات ہے) ابوعبداللہ کے پسماندگان کی گزر اوقات خیرات پر تھی۔'' یہ وہ انجام تھا جو بزدل اور اقتدار پرست سازشی حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ اس کم بخت شخص نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کی، چچا کی پیٹھ میں خنجر گھونپا، آخر میں جن عیسائیوں نے اس سے کام نکل جانے کے بعد اسے دھوکا دیا تھا، غرناطہ کے بہادر عوام کے جنگ پر اصرار کے باوجود انہی عیسائیوں کو اس نے غرناطہ حوالے کیا اور تختِ غرناطہ سے اس وقت تک چمٹا رہا جب تک وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل نہ گیا۔ یہ اگر اس تاریخی موقع کو ضائع نہ کرتا جو اس کے بہادر باپ سلطان ابوالحسن نے فرڈینینڈ کو شکست دے کر حاصل کیا تھا تو آج اندلس کی فضائیں اُذان کی آواز کو نہ ترستیں، وہاں ایسے مسلمانوں کی خلافت ہوتی جو علم و ہنر میں یکتا اور یورپ کے معلّم و قائد تھے۔ یہ لوگ امریکا کو کولمبس سے پہلے دریافت کر چکے تھے لیکن ان کے شکست کھا جانے کے بعد ملکہ ازابیلا نے کولمبس کے ذریعے امریکا دریافت کرنے کا ڈھنڈورا اسی سال پیٹا جو سقوطِ غرناطہ کا سال ہے۔ مغربی مؤرخین اور جغرافیہ دانوں نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ امریکا کولمبس نے (اور ہندوستان واسکوڈی گاما نے) دریافت کیا تھا مگر وہ اس بات کی

کوئی توجیہہ نہیں کر پاتے کہ کولمبس اپنے ساتھ پہلے ہی سفر میں عرب جہاز ران (کپتان) اور ملاّحوں کے علاوہ عرب ترجمان کیوں لے کر گیا تھا؟ نیز یہ کہ کولمبس جب امریکا پہنچا تو وہاں عربی سکّوں میں لین دین کیوں ہوتا تھا اور عربی بولنے والے لوگ وہاں کیوں پائے جاتے تھے؟ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اسے بھی علم تھا کہ عرب اس سے پہلے وہاں پہنچ کر سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ درحقیقت ملکہ ازابیلا کے دیے ہوئے پیسوں سے امریکا دریافت کرنے کی مہم ایسا افسانہ ہے جو یورپ والوں کے تعصب اور دوسروں کے کارناموں کو اپنے نام کرنے کی کم ظرفی پر دلالت کرتی ہے۔ محمد بن عبداللہ بن ادریس جو علوی النسب ہونے کی وجہ سے شریف ادریسی کے نام سے مشہور ہے اور جو چار مستند اور مشہور ترین مسلمان جغرافیہ دانوں میں سے ایک ہے، اس کی کتاب ''نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق'' (یہ علمِ جغرافیہ میں قرونِ وسطی کی جامع ترین تالیف شمار ہوتی ہے) کولمبس کے امریکا پہنچنے سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ ادریسی کی وفات 1266ء میں ہوئی جبکہ امریکا کی دریافت کا غوغا 1492ء میں مچا۔ اس میں اس نے جن آٹھ چچازاد بھائیوں کی خطرناک بحری مہم کا احوال لکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے باہمت مسلمان بحرِ ظلمات کے پار کی دنیا کا راز معلوم کرنے کے لیے عملی طور پر کوشاں رہتے تھے۔ ان کی ایک جماعت اس سمندر کے پاس ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں اشقر (سرخ رنگ کے لوگ) رہتے تھے۔ کولمبس چونکہ امریکا کو ہندوستان سمجھتا تھا اس لیے اس نے انہیں سرخ ہندوستانی (الہنود الاحمر) کا نام دیا۔ وہی سرخ ہندوستانی ہیں جو بعد میں ریڈ انڈین کے نام سے مشہور ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسپین کے مسلمانوں نے امریکا کو صرف بحرِ اوقیانوس کے راستے سے ہی نہیں بلکہ الاسکا کی جانب سے بھی دریافت کر لیا تھا۔ یہ وسطی ایشیا کے مسلمان تھے جو روس کی آخری حدود میں واقع ''بیرنگ'' نامی تنگ سمندری درہ پار کر کے براعظم امریکا میں داخل ہو گئے تھے لیکن ان

کی یہ آمد چونکہ تاجرانہ یا سیاحانہ تھی، فاتحانہ نہ تھی اس لیے یہ کارنامہ چھپا رہ گیا اور اسپین کو مسلمانوں سے چھیننے والوں نے اسے اپنے نام لگوالیا۔

اگر اندلس کے مسلمان اس تاریخی موقعے کو ضائع نہ کرتے تو ظاہری اسباب و امکانات کی حد تک براعظم شمالی و جنوبی امریکا جہاں آج ایک ملک اللہ کے نام لیواؤں کا نہیں، مسلمانوں کے پاس ہوتے اور مسلمان آج اس ذلت اور پسماندگی کا شکار نہ ہوتے جو خود کو عقلِ کُل سمجھنے والے اس حکمران کی بدتدبیری کی وجہ سے ان پر مسلط ہے۔ آج کرۂ ارض کا ایک بڑا حصہ جسے ہسپانوی مسلمان جہاز رانوں اور نقشے دانوں کی مدد سے دریافت کیا گیا، عیسائیت کا گڑھ ہے اور ظاہری اسباب کی رو سے ممکن نہیں لگتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی کے دور سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوگا۔ صدیوں کی یہ سزا مسلمانوں کو اپنے حکمرانوں کے ان غلط فیصلوں کے سبب بھگتنی پڑی ہے جو انہوں نے تاریخی لمحات میں فرض کی پکار پر لبیک کہنے کی بجائے مفاد پرستی کے تحت کئے اور پوری ملت کو ناقابلِ تلافی نقصانِ عظیم سے دوچار کیا۔ ان کی نظر تنگ اور حوصلے سکڑ گئے تھے تو قدرت نے ان کے سامنے زمین بھی تنگ کردی۔ تاریخ کے مطالعے کا اصل مقصد قوموں کے عروج و زوال کے حقیقی اسباب کا مطالعہ اور اس سے سبق و عبرت حاصل کرنا ہے۔ قرآن کریم میں بیان کردہ واقعات اور انسانوں کے اردگرد پھیلے تاریخی حقائق انہیں پکار پکار کر اس کائنات کے تکوینی نظام سے آگاہ کرتے ہیں.......... مگر عقل والوں کے علاوہ کوئی نہیں جو ان پر کان دھرے۔ اندلس سے مسلمانوں کی پسپائی انسانی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے اور اس کا ہر پہلو اپنے اندر عبرت کا جہاں لیے ہوئے ہے۔ اندلس کے عظیم اسلامی آثار جو خود غرضی اور خانہ جنگی کے سبب مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتے رہے، زبانِ حال سے آج کے مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں: اے لوگو! ہمیں عبرت کی نظر سے دیکھو اور ہماری بربادی سے سبق سیکھو کہ جو قوم

ایمان و عملِ صالح، نظم و ضبط اور محنت و دیانت اور جذبہ جہاد سے مالا مال ہوتی ہے وہ زمانے کو مسخر کر لیتی ہے اور جو ان سے محروم ہو جاتی ہے زمانے کے ہاتھوں فنا ہو جاتی ہے، وقت انہیں صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیتا ہے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔

دوسرا باب

دوزخِ دہن کشیدہ

اصل یروشلم سے پہلے

(امریکا میں یہودی تسلط کا پس منظر اور اسباب)

امریکا کی سیاست، معیشت اور معاشرت پر یہودیوں کا غلبہ تاریخ کے طالب علم کے سامنے اہم سوال ہے۔ آج سے تقریباً 515 سال پہلے تک جب براعظم امریکا دریافت نہ ہوا تھا اور معلوم دنیا تین براعظموں تک محدود تھی تو یہودی ایک براعظم (ایشیا) سے نکالے جانے کے بعد دوسرے (یورپ) میں رُل رہے تھے۔ یہ اچانک کیسے اس نو دریافت شدہ براعظم میں پہنچ گئے اور پھر وہاں کی اقلیت ہونے کے باوجود اکثریت کو استعمال کرنے والی اہم ترین طاقت کیسے بن گئے؟ اس سوال کی گتھیاں سلجھانے سے بہت سے راز آشکارا ہوتے ہیں اور بہت سی چیزیں کھل کر سامنے آتی ہیں جو آج کے طالب علم کے سامنے آنا ضروری ہیں۔ اس کے بغیر امریکا سے مشرقِ وسطیٰ تک رواں دواں عالمی سیاست کے پسِ پردہ کارفرما حقیقی عوامل اوجھل رہیں گے۔

یہود اپنی بداعمالیوں کے سبب جب یروشلم (موجودہ القدس) سے دوسری مرتبہ جلاوطن ہوکر دربدر کیے گئے تو ان کے مختلف قبائل نے جہاں سینگ سمایا بکھر گئے (دیکھیے

مسلکہ نقشہ) سارے جہاں میں ان کو کہیں اماں نہ ملتی تھی۔ تنگ دل اور متعصب عیسائی اپنی روایتی تنگدلی اور یہود کے کرتوت کی بنا پر ان سے سخت دشمنی رکھتے تھے البتہ مسلمان اپنی روایتی وسعت ظرفی اور اہل کتاب سے یک گونہ تعلق کی بنا پر ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ افریقہ کی شمالی پٹی کو فتح کرتے کرتے جب مسلمان اس کے آخری کنارے موجودہ مراکش جسے عرب المغرب الاقصیٰ (زمین کی آخری مغربی حد) کہتے ہیں تک جا پہنچے تو یہ وہ جگہ تھی جہاں اس وقت کی معلوم دنیا کی حدود ختم ہوتی تھیں۔ سکندر ذوالقرنین (یونانی بادشاہ) اپنے پہلے سفر میں جو مغرب کی جانب تھا، یہیں پہنچ کر آگے نہ جا سکا اور سورج کو بحر اوقیانوس میں ڈوبتے دیکھتا رہ گیا تھا۔ یہ مغرب کی جانب خشکی کا آخری کنارہ تھا۔ اس کے بعد بحر اوقیانوس شروع ہو جاتا تھا جسے ''بحر ظلمات'' کہتے ہیں یعنی اندھیروں بھرا سمندر۔ اس وقت تک کوئی نہ جانتا تھا کہ اس سمندر کے پار کیا ہے۔ اس حوالے سے طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ سمندری سفر کے ایسے ذرائع ایجاد نہ ہوئے تھے کہ کوئی جہاز ران اتنا طویل سفر جس کی کوئی حد متعین نہ تھی، طے کر کے زندہ سلامت واپس آ جائے۔ مشہور مسلمان سپہ سالار فاتح افریقہ عقبہ بن نافع نے فتح افریقہ کا مشن مکمل کرنے کے بعد اپنا گھوڑا یہیں پر سمندر میں ڈال کر تاریخی جملے کہے تھے۔ اس کے بعد آنے والے فاتحین نے اپنا رُخ دائیں طرف تبدیل کیا اور درۂ جبرالٹر عبور کر کے یورپ میں داخل ہو گئے۔ (نقشے پر ایک نظر دوبارہ ڈالیے) ہسپانیہ میں مسلمانوں کے شاندار دور کا آغاز ہوا۔ اس آغاز کے ساتھ ہی یہود کو پرسکون پناہ گاہ میسر آ گئی لیکن ہسپانیہ میں مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی وہ پھر بے آسرا و بے سہارا ہو گئے۔ قرآن کریم کے مطابق تکوینی طور پر یہ بات لکھ دی گئی ہے کہ وقتاً فوقتاً یہود پر عذاب ہوتا رہے گا اور یہ کسی کے سہارے ہی جی سکیں گے۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیں گے تو کھڑا ہونے سے پہلے ہی ان کے گھٹنے پیٹ سے جا لگیں گے۔ ہسپانیہ کی

مسلمان حکومتیں یہودیوں سے فراخدلانہ سلوک کرتی تھیں اور یہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اب مسلم حکومت کے دن باہمی اختلاف اور منافرت کی بنا پر گنے جا چکے ہیں اور متعصب عیسائیوں کے برسراقتدار آنے کے بعد ان کو عیسائی بننا ہوگا یا اسپین چھوڑنا ہوگا۔ مسلمانوں سے زیادہ یہودیت پر یہ کڑا وقت تھا۔ انہیں کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ کہاں جائیں اور اپنی عیارانہ فطرت اور نافرمان سرشت کی بقیہ سزا کہاں کاٹیں کہ اتنے میں ایک یہودی النسل اطالوی جہاز ران کولمبس کی شکل میں انہیں اُمید کی کرن نظر آئی۔

کرسٹوفر کولمبس 1451ء میں اٹلی میں اون اور ریشم کے کاریگر ڈومینیکو کولمبس کے ہاں پیدا ہوا اور جلد ہی لکھنا پڑھنا سیکھ گیا۔ کم عمری میں ہی اپنے باپ کے کاروبار میں شریک ہوگیا لیکن اس کی دلچسپی ہمیشہ بحری جغرافیے سے رہی۔ نوعمری میں ہی کولمبس نے بحری نقشے بنانے اور سمجھنے شروع کر دیے تھے۔ 14 سال کی عمر میں وہ بحری جہاز پر ملاح کی حیثیت سے ملازم ہو گیا اور 21 سال کی عمر میں اس کا شمار بحری مہم جوؤں میں ہونے لگا۔ 1477ء میں کولمبس مستقلاً پرتگال میں آبسا چونکہ پندرہویں صدی میں پرتگال کے ساحلوں سے بحری مہم جوئی اٹلی کی نسبت زیادہ منفعت بھری تھی۔ 1478ء میں لزبن میں کولمبس کی شادی پورٹر سانٹو کے گورنر بارٹولومو کی بیٹی فلیپا مونیز سے انجام پائی۔ اسی دوران کولمبس کے ذہن میں ایسی بحری مہم جوئی کا خیال سنجیدگی سے اُبھرنے لگا کہ جس کا نتیجہ مالی منفعت، حیران کن نتائج اور نامعلوم زمینوں کی دریافت سے ہو۔ گورنر بارٹولومو جو خود بھی بحری مہم جوئی سے وابستہ رہا تھا اور سمندری جغرافیے پر حیران کن حد تک سائنسی معلومات رکھتا تھا، کولمبس کا بہترین رہنما ثابت ہوا۔ بارٹولومو کی وفات پر اس کے تمام کاغذات اور کتابیں کولمبس کے تصرف میں آ گئیں جن میں تفصیلی سمندری نقشے، چارٹ، سمندر میں مختلف علاقوں کے موسمی حالات، پانی کا دباؤ، لہروں کا اُٹھان، امکانی مصائب، بحری مہم جوؤں کے انٹرویوز، بحری

جہازوں کی موزونیت اور اسی طرح کی بیش بہا معلومات نے کولمبس کے مغرب کی طرف سے مشرق میں پہنچنے کے نظریہ کو پختہ کر دیا۔ کولمبس اپنے تجربے، معلومات اور تحقیق سے اس نظریہ میں پختہ ہو چکا تھا کہ انتہائی مشرق میں مغرب کی طرف سے سمندری راستے سے پہنچا جا سکتا ہے۔

غالباً کولمبس نے اپنے اس نظریے کی بنیاد مارکو پولو کے اس نظریے پر رکھی جس میں مارکو پولو نے قبلائی خان کے عہد میں چین کا محل وقوع جزائر کنیری کے متوازی قرار دیا تھا۔ سو کولمبس کے خیال میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر وہ جزائر کنیری سے بحری مہم کا آغاز کرے تو وہ مغرب کی سمت سے سمندر میں سفر کرتے ہوئے بالآخر مشرق میں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پندرہویں صدی میں زمین کا گول ہونے کی بجائے بیضوی مانا جانا اور تمام سمندروں کا آپس میں جڑے ہونے کا تصور بھی کولمبس کو اپنے نظریے پر ثابت قدمی سے جمے رہنے پر مائل رکھتا تھا۔

پندرہویں صدی کے مہم جوؤں کی مجبوری کے عین مطابق کولمبس کو بھی ایک ایسے مقتدر اعلیٰ سرپرست کی ضرورت تھی کہ جو اس کی دریافت کردہ دنیا کو قانونی، سیاسی، مالی وفوجی تحفظ فراہم کر سکے تاکہ وہاں پر آبادکاری کے حقوق محفوظ رکھے جا سکیں اور نئی دریافت کردہ کالونی قانونی ملکیت کے حصار میں آ کر کسی اور کے دعویٰ ملکیت سے محفوظ ہو جائے۔ سرپرستی کی اس ضرورت کے مدنظر کولمبس نے 1481ء میں پرتگال کے بادشاہ جان دوئم سے اپنی بحری مہمات کی کفالت اور سرپرستی کرنے کی درخواست کی جو پرتگال کی جغرافیائی کونسل نے مسترد کر دی۔ اسی طرح 1482ء میں برطانیہ اور 1484ء میں فرانس کے بادشاہ نے بھی کولمبس کی درخواست کو شرف قبولیت سے محروم رکھا۔ 1485ء میں کولمبس اسپین کے شاہی دربار سے مدد حاصل کرنے کی غرض سے اسپین آیا اور قرطبہ میں مقیم ہو گیا۔ وہ قرطبہ،

غرناطہ اور سرقسطہ میں امرا اور حکام کو اپنی مہم جوئی کے منصوبے کے حق میں استوار کرتا رہا لیکن مسلمان امرا نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس کا خمیازہ مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں۔ ہسپانیہ کے آخری مسلم حکمران سقوط ہسپانیہ کے ہی نہیں، امریکا کی دریافت اور وہاں اسلام کی حکمرانی سے محرومی کے بھی مجرم ہیں۔ اس دوران مسلمانوں اور عیسائیوں کے دوران جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوچکی تھی اور ہسپانیہ کے مستقبل کے فیصلے پر یہ بات موقوف تھی کہ نئے دریافت ہونے والے براعظم کا حکمران کون ہوگا؟ مسلمان جو کہ تین براعظموں میں پھیل چکے ہیں یا عیسائی جوان سے یورپ چھیننے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

قرعۂ اعمال عیسائیوں کے نام نکلا اور 6 جنوری 1492ء کو ملکہ ازابیلا اپنے لاؤلشکر کے ساتھ باب العدل سے قصر الحمرا میں فاتحانہ داخل ہوئی اور جشنِ فتح کی تقریبات کا آغاز ہوا۔ اس دوران کرسٹوفر کولمبس غمزدہ اور بے زار الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ ابھی جشن فتح جاری ہی تھا کہ وہ وہاں سے چل دیا۔ کولمبس کی اس دل زدگی کی وجہ یہ تھی کہ ایک روز قبل ہی ملکہ و بادشاہ کی طرف سے نامزد کردہ جغرافیائی کونسل جسے کولمبس کی بحری مہم کا منصوبہ جانچنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس کونسل نے نئی دنیا کی دریافت کے لیے کولمبس کی بحری مہم کا منصوبہ مسترد کر دیا تھا۔ کونسل کا کہنا تھا کہ کولمبس کا منصوبہ اس کی ناقص معلومات پر استوار ہے اور اس میں سرمایہ کاری خسارے کا سودا ہوگا۔

کولمبس جو ایک طویل عرصے سے شنوائی کی اُمید پر غرناطہ، المیرا، مالغا اور قرطبہ میں مقیم رہا تھا، مسلمانوں کے بعد عیسائی کونسل کے یکساں فیصلے سے دل برداشتہ ہوا اور پرتگال واپسی کے ارادے سے غرناطہ سے چل پڑا۔ اس موقع پر ہسپانیہ کی یہودی اشرافیہ آگے آئی۔ وہ اس موقع کو گنوانا نہ چاہتی تھی۔ لہٰذا ہسپانیہ کے مالدار یہودی کولمبس کی حمایت پر کمربستہ ہوگئے۔ یہودیوں کو نئی دنیا کی دریافت میں وہ ملک نظر آنا شروع ہوگیا تھا کہ وہ

جہاں اسپین میں ہزیمت کے بعد پھر سر اُٹھا سکتے تھے۔

6 جنوری 1492ء کو جب کولمبس قصر الحمرا سے جشن فتح کو ادھورا چھوڑ کر وہاں سے پرتگال کے لیے روانہ ہوا تو ملکہ ازابیلا کے منہ چڑھے ایک یہودی مصاحب لوئیس سنٹا جل نے ملکہ سے فوراً ملاقات کر کے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ایک بار پھر کولمبس سے مل کر نئی دنیا کی دریافت کے بارے میں اس کی مہم جوئی کے منصوبے پر ہمدردانہ غور کرے۔ شاہی دربار میں میں جب کولمبس کی مہم پر خطیر اخراجات کی فراہمی کا معاملہ زیر بحث آیا تو لوئیس سنٹا جل نے کولمبس کے منصوبے میں ذاتی سرمایہ کاری کی حد میں خطیر رقم کی پیش کش کرتے ہوئے اپنے یہودی رفقا کو بھی کولمبس کی بحری مہم میں سرمایہ کاری پر راغب کر لیا۔ خفیہ طور پر یہ طے کیا جا چکا تھا کہ اگر ملکہ و بادشاہ کولمبس کی بحری مہم میں سرمایہ کاری و سرپرستی سے انکار کر دیں تو لوئیس سنٹا جل اور اس کے یہودی رفقا بہر حال کولمبس کے منصوبے کو ذاتی سرمایہ کاری سے کامیاب بنائیں گے۔

کاش! ہسپانیہ سے پسپا ہونے والے مسلمان اس مہم میں سرمایہ کاری کر لیتے لیکن...... اس لیکن کے بعد بہت سی حسرتیں تشنہ رہ جاتی ہیں۔ نجانے ہمارے دل کے داغ کب دھلیں گے؟؟!

کسی پراسرار اور خفیہ ترغیب کی بدولت کولمبس کے حامیوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت ہر اس بااثر یہودی کو جو ملکہ و بادشاہ کی رائے پر اثر انداز ہوسکتا تھا۔ کولمبس کے حق میں استوار کر رہی تھی۔ محققین اور مورخین نے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے میں خاصی جانکاری کی ہے کہ آخر ہسپانیہ کے یہودی اشراف کولمبس کی مہم میں سرمایہ کاری کا خطرہ کیوں مول لینا چاہتے تھے؟ جبکہ یہ یہودی نکتہ نظر اور یہودی کاروبار اصول کے سراسر منافی ہے کہ ایک ایسے پروجیکٹ میں سرمایہ کاری کی جائے جس میں ناکامی

کی شرح اس کی کامیابی سے کہیں زیادہ ہو۔ بات یہ ہے کہ اندلس کے کے یہودی اشراف کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا کہ وہ کولمبس کے منصوبے سے صرف نظر کر سکتے۔ اندلس کے یہودی امرانے یہ نوشتہ دار پڑھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی کہ سقوط غرناطہ کے ساتھ ہی ان کے اثاثے، مال متاع، اراضی، جاہ و حشم، محلات اور امارت سب کچھ ڈوب جائے گا سو جس کا مال چھن جانا یقینی تھا اسے کولمبس کی کامیابی کی مبہم ترین اُمید پر بھی لگا دینے میں خسارہ بہرحال نہیں تھا۔

کولمبس نے اپنے یہودی محسنوں کے احسانات یاد رکھے۔ نئی دنیا کی دریافت کی کامیابی پر پہلا خط کولمبس نے لوئیس سنتا جل کو ہی لکھا جس نے ملکہ و بادشاہ کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ بہرحال کولمبس کے پیچھے پیچھے امریکا کی شکل میں یہودیوں کو جائے پناہ ہی میسر نہیں آئی بلکہ وہ اسے یروشلم کے حصول کی پہلی منزل بھی سمجھتے تھے۔ یہودی زعما کی نظر میں یورپ سے بھاگ کر امریکا میں جانا مصر کے (فرعونی مظالم سے نجات پا کر ملک کنعان (فلسطین)) میں بس جانے کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ آبادکار امریکا کی مختلف آبادیوں کا نام اپنے اپنے آبائی علاقے کے نام پر رکھتے تھے جبکہ یہود نے امریکا میں اپنی آبادکاری کے ایک مقام کا نام ''کنیکٹی کٹ'' رکھا جس کا مفہوم ہے ''کنعان جدید'' موجودہ امریکا کا پہلا صدر اور اس کا بانی مبانی جارج واشنگٹن نہ صرف یہ کہ ایک کٹر فری میسن تھا بلکہ اس کے بڑے روحانیین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ مشہور بنیاد پرست امریکی صدر رونالڈ ریگن جو ایک خوفناک بیماری کا شکار ہو کر انتہائی عبرتناک حالت میں مرے، امریکا کو نیا یروشلم قرار دیتے تھے جو صرف اس لیے وجود میں آیا ہے کہ اصل یروشلم آباد ہو جائے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا قیام اسرائیل اور باضابطہ قیامِ حکومتِ دجال سے قبل کی ایک عبوری حکومت ہے۔ چونکہ امریکا عیسائی ریاست نہیں بلکہ ایک یہودی ریاست ہے

اس لیے امریکا کا سب سے بڑا سرکاری تہوار کرسمس نہیں بلکہ "Thanksgiving" ہے جو دراصل Jewish Festival of Harvest of Succoth کا دوسرا نام ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی سرکاری مہر اور نشان The Great Seal of the United States مشہور فری میسن مہر اور نشان ہے۔ چونکہ امریکا محض ایک سیاسی وجود کا نام نہیں بلکہ یہودی روحانی سفر کی ایک منزل ہے اس لیے اس کا تقدس پوری طرح اور ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ White House فری میسن اور یہودی روحانیین کی اس مقدس آبادی کو کہتے ہیں جو ہیکل سلیمانی سے باہر دنیا میں کسی جگہ ہو سکتی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جسے یہودی روحانیین کی تاریخ میں Casa Blanca (قصرِ ابیض) بھی کہتے ہیں۔ افواج امریکا کے صدر دفتر اور سپریم کمانڈ ہیڈ کوارٹرز کو Pentagon کہتے ہیں۔ یہ دراصل فری میسنوں کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی مہر یا ڈھال کا نام ہے۔ Pentagon یعنی پنج گوشہ دراصل اسی کا اظہار ہے۔

کاش! عرب لیگ کے ارکان مسلم حکمرانوں کو کوئی صاحب دل تاریخ کے اس اوجھل پہلو سے آگاہ کر دے تو کم از کم ارض مقدس کے مسئلے کو عربوں کا مسئلہ قرار دینے کی بجائے مسلم اُمہ کا مسئلہ سمجھ کر درست زاویے سے دیکھنا شروع کر دیں۔

کہیلا کی کہانی

نئے یروشلم کی طرف:

امریکا میں یہودیوں کی تاریخ کا آغاز کرسٹوفر کولمبس سے ہوتا ہے۔ یہودیوں نے سقوطِ غرناطہ سے پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور انہیں احساس ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کا سایہ ہٹنے کے بعد عیسائی ان کی بوٹیاں پکڑ پکڑ کر کے نوچیں گے۔ مشہور امریکی صنعت کار اور مصنف ہنری فورڈ نے اپنی کتاب "The InterNational Jew" میں لکھا ہے:

''کولمبس کے ارادوں کی بھنک پا کر یہودیوں نے اس سے میل جول خوب بڑھا لیا تھا اور اس کے ساتھ جانے والے ہمراہیوں میں ایک گروہ یہودیوں کا بھی تھا۔'' اندلس کے مشہور یہودی عالم اور شاعر یہودا حلیوی (Judah Halevi) نے بدنام زمانہ یہودی تاویل و تحریف سے کام لیتے ہوئے ملتِ یہود کو اجازت دے دی تھی کہ وہ دنیوی مصائب سے بچنے اور اپنا دین بچانے کے لیے اپنا مذہب پوشیدہ یا تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے لیے بدترین دشمن سے تعلقات قائم کرنا بھی مشکل نہ رہا تھا۔ یہ کسی بھی مذہب والوں سے بڑھ کر مذہبی بن جاتے اور انہیں شیشے میں اتار لیتے تھے چنانچہ کولمبس سے جلد ہی ان کا

یارانہ لگ گیا۔ انہیں اس وقت ارضِ نجات اگر کوئی دکھائی دیتی تھی تو وہ یہی بحرِ ظلمات کے پار کی دنیا تھی۔ اس کے نا قابلِ عبور سمندر کے اِس طرف کی دنیا میں تو وہ اپنی حرکتوں کے سبب ہر جگہ دھتکار دیے گئے تھے اور سمٹتے سمٹتے اس کے کنارے آ پہنچے تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں کئی شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو اس بحری مہم سے جو سقوطِ غرناطہ کے بعد مسلمانوں کے بحری تجربات سے فائدہ اٹھا کر روانہ ہو رہی تھی، خصوصی دلچسپی تھی۔ پہلا تو یہ کہ اس بحری سفر کے اخراجات کے لیے بدنام زمانہ یہودی سودی سرمایہ کام آیا تھا، ملکہ ازابیلا کے جواہر فروخت کر کے اس بحری سفر کے اخراجات برداشت کرنے کی روایت محض افسانہ ہے۔ دوسرا یہ کہ نئی سرزمین کی دریافت کے بعد کولمبس نے جو پہلا خط لکھا وہ ایک سرمایہ دار یہودی کے نام تھا جس نے اس سفر کے لیے کئی ہزار پاؤنڈ فراہم کئے تھے۔ تیسرا یہ کہ لوئی ڈیٹورس نامی پہلا شخص جو ساحل پر اترا وہ یہودی تھا۔ اس نے تمباکو کا استعمال دریافت کیا، اسے تمباکو کی عالمی تجارت کا ''باپ'' کہا جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے آج دنیا میں تمباکو کا سارا کاروبار یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ پہلے پہل یہودی کیوبا اور برازیل میں آباد ہوئے لیکن جب یہاں سے اپنی حرکتوں کے سبب جلد دُھتکار دیے گئے تو انہوں نے نیویارک کا رخ کیا کیونکہ وہ شمالی امریکا کا تجارتی دروازہ تھا۔ نیویارک اس وقت ڈچ کالونی تھا۔ یہاں کے مقامی لوگوں نے ان کی آمد کو پسند نہیں کیا تاہم یہودی سرمایہ کا طلسم کام آیا اور ڈچ گورنر پیٹر اسٹائی ویسنٹ نے یہودیوں کو اس پابندی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی کہ وہ سرکاری ملازمت نہیں کریں گے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ وہ جن لوگوں پر ملازمت کی پابندی لگا رہا ہے وہ اپنی سازشی فطرت کے بل بوتے پر کل اس شہر کے تمام کاروبار اور عہدوں کے مالک ہو جائیں گے۔ الغرض اس گروہ نے امریکا کو ارضِ موعود اور نیویارک کو نیو یروشلم قرار دے کر یہودیوں کو یہاں نقل مکانی کی ترغیب دی

اور اس طرح نیویارک دنیا کی یہودی آبادی کا بہت بڑا مرکز بنتا چلا گیا۔ انہوں نے اس شہر کی زمین کی ملکیت حاصل کرنا شروع کر دی، اس کی تجارت، سیاست اور انتظامیہ کو اپنے زیراثر لانا شروع کیا اور اس مقصد کے لیے ''کہیلا'' نامی تنظیم وجود میں آئی۔

اچھی امید کا کنارہ:

کہیلا کی کہانی شروع کرنے سے پہلے مکافاتِ عمل کی ایک تاریخی مثال کا مطالعہ کرتے چلتے ہیں۔ کولمبس نے نئی دنیا کی دریافت اپنے نام لکھوالی لیکن وہ اس ملک کو براعظم کولمبس یا یونائیٹڈ اسٹیٹس آف کولمبس نہ کہلوا سکا۔ مسلمانوں کی دریافت اپنے نام کرنے کے باوجود وہ اس اعزاز سے محروم رہا۔ ہوا یوں کہ مسلم ہسپانیہ کے سقوط کے بعد ہسپانیہ کے حریص حکمرانوں نے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے کے لیے دو ٹیمیں بھیجیں۔ ایک واسکوڈی گاما کی سربراہی میں تھی۔ یہ مہم جب جنوبی افریقہ کے آخری زمینی کنارے کے پاس پہنچی تو اسے سمندر مڑتا ہوا دکھائی دیا۔ انہیں امید پیدا ہو چلی کہ یہ راستہ مڑ کر ہندوستان کو جائے گا۔ لہٰذا اس کا نام.......... کیپ آف گڈ ہوپ (عربی میں **رأس الرجاء الصالح**، اردو میں ''اچھی امید کا کنارہ'' کہہ لیجئے) لکھ دیا گیا۔ جنوبی افریقہ کا یہ کنارہ اس سمت میں خشکی کا آخری سرا ہے اس کے بعد قطب جنوبی تک پانی ہی پانی ہے۔ یہاں بحرِ ہند اور بحرِ اوقیانوس دو سمندر آ کر ملتے ہیں اس وجہ سے تلاطم برپا رہتا ہے۔ اس سے قبل ہسپانوی جہازراں افریقہ کے مغربی کنارے پر واقع ممالک سینیگال، گنی، گمبیا، سیرالیون وغیرہ تک تو آئے تھے لیکن اس سے آگے نہ جا سکے تھے۔ یہ پہلی مرتبہ تھی کہ وہ اس کنارے تک آ پہنچے تھے۔ مشہور ہے کہ یہاں پہنچ کر جب انہوں نے سمندر بہت زیادہ خراب دیکھا تو واسکوڈی گاما سے واپس چلنے پر اصرار کیا اور نہ ماننے پر قتل کی دھمکی دی۔ واسکوڈی گاما بڑا کائیاں تھا۔ اس نے بحری راستوں کے نقشے ان کے سامنے پھاڑ دیے اور کہا کہ اب واپسی کا راستہ

صرف میرے ذہن میں ہے تم میرے بغیر واپس نہ جاسکو گے حالانکہ یہ راستے اس کے ساتھ جانے والے عرب مسلمان بھی جانتے تھے۔ الغرض اس نے اس طرح سے دنیا کے اس جنوبی کنارے کو پار کیا اور موزمبیق چینل سے گزرتے ہوئے موزمبیق جا پہنچا۔ وہاں سے راشن، خوراک اور جہازوں کی مرمت کا بندوبست کر کے اس نے بحرِ ہند عبور کیا اور ہندوستان کی بندگارہ کالی کٹ جا اُترا۔ یہ ہندوستان کی سرزمین پر غیرملکی استعمار کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد ولندیزی، پھر فرانسیسی اور آخر میں انگریز آ دھمکے، آگے کی دل فگار داستان سب کو معلوم ہے۔

امریگو سے امریکا تک:

کولمبس کی بحری مہم کا احوال آپ سن چکے ہیں چونکہ وہ بھی ہندوستان کی دریافت کی مہم پر روانہ ہوا تھا اس لیے جزائر بہاماس اور سان سلواڈور کے پاس پہنچ جانے پر وہ اسے مغربی ہندوستان کے جزائر (ویسٹ انڈیز) سمجھتا رہا، اس کا خیال تھا کہ ان جزائر کے بعد ہندوستان کا براعظم ہے۔ اس کی اس غلط فہمی سے ان جزائر کا نام تو جزائرالہند پڑ گیا اور آج تک یہی نام چلا آتا ہے مگر امریکا اس کے نام سے موسوم ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ان جزائر کو انڈونیشیا اور فلپائن سے ممتاز کرنے کے لیے جزائر غرب الہند اور انڈونیشیا وغیرہ کو جزائر شرق الہند کہتے ہیں۔ کولمبس کے پانچ سال بعد 1497ء میں ایک اطالوی بحری مہم جو اور سمندری جغرافیہ دان امریگو واسپوشی سمندر پار پہنچنے کی مہم میں کامیاب ہوگیا۔ یہ شخص لکھاری بھی تھا۔ اس نے واپس پہنچ کر اپنی مہم کے احوال نئی دنیا کے محل وقوع اور بحری نقشہ جات کے ساتھ قلم بند کیے۔ مہم جوئی کی یہ بحری داستان یورپ میں کافی مقبول ہوئی۔ 1507ء میں مشہور جرمن جغرافیہ دان پروفیسر مارٹن الڈ سیمولر نے اپنی مشہور کتاب Cosmographia introduction میں امریگو کو امریکس کے نام سے متعارف

کرواتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ چونکہ امریکس نے یہ نئی دنیا دریافت کی ہے اس لیے اس نئے دریافت شدہ براعظم کا نام اس کے نام سے منسوب کر دینا چاہیے۔ اس نے یورپ اور ایشیا کے نسوانی طرز کے ناموں کے مقابلے میں امریکس کے نام پر امریکا تجویز کیا۔ پروفیسر مارٹن کا یہ نظریہ مقبول ہوا اور یوں یورپ میں براعظم کولمبس کی بجائے براعظم امریکا کے نام سے یہ نئی دنیا مشہور ہوگئی۔ کولمبس نے مسلمان جہاز رانوں کی محنت پر اپنی شہرت کا تنبو تاننا چاہا تھا مگر یہ ناانصافی اسے راس نہ آسکی اور وہ مغربی منطقہ حارّہ کی دریافت کو اپنے نام سے منسوب کئے جانے کے اعزاز سے محروم رہا۔ مکافاتِ عمل کی اس روداد کے بعد واپس کہیلا کی طرف چلتے ہیں۔

دنیا کے بارہ حصے:

''کہیلا'' کے معنی گورنمنٹ کے ہیں۔ یہ یہودیوں کی زیرزمین تنظیم ہے جو جتنی پوشیدہ ہے اتنی ہی طاقتور بھی ہے۔ نیویارک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اس کا عمل دخل اتنا زیادہ ہے کہ آپ کہہ سکتے ہیں نیویارک کے باشندے غیرمحسوس طریقے سے اس کے پروگرام پر چلتے ہیں اور اس کا پروگرام کیا ہوتا ہے؟ یہود، یہودیت اور یہودی مفادات۔ یہ صرف تنظیم نہیں، خفیہ حکومت ہے۔ ایسی خفیہ حکومت جس کا ہر لفظ قانون ہے اور ہر عمل یہود نوازی، یہود پروری اور یہود کی سرپرستی کے گرد گھومتا ہے۔ یہ تنظیم امریکا کے سب سے بڑے تجارتی و سیاسی مرکز میں بیٹھ کر امریکی رجحانات اور پالیسیوں پر اثرانداز ہونے کے ایسے طور طریقے اختیار کرتی ہے کہ ان کا مطالعہ کرنے والا انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اس نے امریکی طرزِ معاشرت، امریکی فکر اور امریکی سیاست کو اس قدر اپنا تابع بنالیا ہے کہ یہ سب چیزیں یہودیت زدہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ امریکی معاشرے کی کسی چیز کی اپنی کوئی انفرادیت باقی نہیں رہی ہے۔ یہودیوں کے بڑوں نے نیویارک کو چھوٹے

چھوٹے بارہ ٹکڑوں میں اور پورے امریکا کو بارہ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ہر ٹکڑے اور حصے کا سربراہ ایک طاقتور اور بااثر یہودی ہے۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کے 12 بڑے یہودیوں کی نگرانی میں 12 قبیلے اور ہر قبیلے کا ایک الگ سردار بنایا گیا تھا) امریکا پر غلبہ پانے کے بعد انہوں نے پوری دنیا کو بھی بارہ بڑے یہودیوں کی نگرانی میں بارہ حصوں میں تقسیم کر دیا اور نیویارک کو تمام دنیا کا مرکز مان کر اسے یہودی دارالخلافہ قرار دے دیا۔ آج کل کے باخبر امریکی بھی نہیں جانتے کہ اگرچہ ان کے ملک کا دارالحکومت واشنگٹن ڈسٹرکٹ آف کولمبیا (واشنگٹن ڈی سی) ہے لیکن ان کے ملک میں ایک قوم ایسی بھی رہتی ہے جو نیویارک کو اپنا دارالحکومت مانتی ہے اور اس قوم کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے افراد نیویارک کو (جو فلسطین میں واقع اصل یروشلم تک رسائی سے پہلے یہودیوں کے لیے نیویروشلم تھا) اس طرح احترام سے دیکھتے ہیں جیسے کیتھولک عیسائی روم (ویٹی کن سٹی) کو اور مسلمان مکہ معظمہ کو۔ ریاست کے اندر ریاست کی اصطلاح مشہور تو بہت ہے لیکن اگر کوئی اس کی عملی مثال دیکھنا چاہے تو نیویارک کو دیکھے کیونکہ یہ ریاست کے اندر ریاست بلکہ عالمی ریاست کا کھلا نمونہ ہے۔ لفظ کہیلا کے معنیٰ گورنمنٹ کے ہیں اور یہود نے خفیہ گورنمنٹ بلکہ سپر گورنمنٹ قائم کر کے اس لفظ کی معنویت کو پوری شدت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔ یہودیوں کی یہ خفیہ تنظیم ''زیرِ زمین ندی'' (Underground River) کی طرح ہے اور یہودیت پر تحقیق کرنے والے ماہرین اسے یہودیوں کی اعلیٰ ترین تنظیم زنجری (Zinjry) کا مضبوط ترین عضو قرار دیتے ہیں۔ یہ لفظ بین الاقوامی صہیونی یہودیت (Zionist International Jewry) کا مخفف ہے۔ یہ صہیونیت کے بڑے دماغوں پر مشتمل وہ اعلیٰ ترین باڈی ہے کہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہزاروں یہودی تنظیمیں اس کے ماتحت کام کرتی ہیں۔

یہودن عورتوں کے شوہر:

یہاں پر قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ذلت کے مارے یہود کو اس قدر عروج کیسے مل گیا کہ وہ پسِ پردہ رہ کر سپر پاور کی ڈور کھینچتے اور ڈھیلی چھوڑتے ہیں؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں کتابِ حقیقت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ہمارے اور خالقِ کائنات کے درمیان رابطے کے دو مستند ذرائع میں سے پہلا ذریعہ ہے اور کائنات کے حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے۔ اللہ پاک نے قرآن کریم میں یہود کی ذلت کے جو اسباب بیان فرمائے تھے، لگتا ہے صدیوں تک زمانے بھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد انہوں نے ان کا کسی حد تک تدارک کیا ہے اور افسوس ہے کہ مسلمانوں نے صدیوں تک ان ملعون صفات سے بچنے کے بعد اب ان کو مکمل طور پر اپنالیا ہے.......... لہٰذا صفحہ کائنات پر نتائج برعکس پیدا ہورہے ہیں۔ مثلاً ایک سبب یہ تھا کہ یہود میں اتفاق نہیں، مگر اب یہودیوں کا حال یہ ہے کہ عملاً سب یہودی ایک اور ان کی تمام تنظیمیں متحدہ مقاصد کے حصول کے لیے یکجان ہیں۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات ان میں اتنا تعلق اور تعاون نہ رہے مگر غیر یہود سے ان کی نفرت قائم رہتی ہے اور یہی چیز انہیں متحد رکھنے کے لیے کافی ہے۔ پھر ان کی سرکردہ تنظیموں اور دانشوروں کے دستور میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ وہ یہودی عوام یا یہودی تنظیموں کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کروائیں اور انہیں باہم دست و گریباں ہوکر اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف خرچ کرنے سے بچائیں۔ خدالگتی کہئے کیا مسلمانوں میں بھی ایسا کوئی نظم موجود ہے؟ قرآن کریم نے یہود کے بارے میں جو فرمایا تھا: ''تم انہیں متحد سمجھو گے مگر درحقیقت ان کے دل جدا ہیں۔'' یہ آیت آج ہم پر صادق آتی ہے یا یہود پر؟ پھر اگر کوئی معاملہ ایسا ہو جو ان تنظیموں کے بس میں نہ رہے تو فریقین متفقہ طور پر کسی ایک بزرگ یہودی شخصیت کو اپنا ثالث تسلیم کرلیتے ہیں جیسے کہ مصر کے صدر انور سادات کی

یہودن بیوی جہاں سادات کو یہود کی دو بڑی تنظیموں کے مشہور زمانہ اختلاف کے وقت متفقہ طور پر ثالث تسلیم کرلیا گیا تھا۔ (یہودی بیویاں رکھنے والے مسلم اور غیر مسلم حکمرانوں مثلاً یاسر عرفات، شاہ حسین، راجیو گاندھی وغیرہ کی فہرست اور کارنامے ایک مستقل مقالے کا موضوع ہیں۔ ہمارے تحقیق کار اس پر دلجمعی سے کام کریں تو دنیا کے سامنے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے۔)

وادیٔ طور میں گریہ وزاری:

قرآن شریف کے مطابق ان کی پسماندگی اور خواری کا ایک سبب بُخل تھا۔ آج کا یہودی......... اجتماعی مقاصد کے لیے خرچ کرنے والوں میں سب سے آگے ہے اور یہودی تنظیموں کو سرمائے کی کمی کبھی بھی مسئلہ نہیں رہی۔ اس میدان میں اگر کوئی پیچھے ہے تو مسلمان کہ دینی اداروں اور تنظیموں کو سب سے بڑا اور گھمبیر مسئلہ مالیات کے حوالے سے ہوتا ہے۔

یہودیوں کے خوار ہونے بلکہ خواری میں ضرب المثل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بزدل اور کم حوصلہ تھے۔ بزدل تو وہ آج بھی ہیں لیکن ان کے حوصلے کو دیکھیے کہ خدائی سزا کے طور پر مسلط کردہ اقوام کے ہاتھوں صدیوں تک مار کھانے کے بعد پھر اپنے مقرر کردہ راستے پر چلنا شروع ہوگئے ہیں۔ وہ ذلت کا طویل دور گزارنے کے باوجود ذہنی الجھاؤ یا بے حوصلگی کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنا مقصد ایسا معین اور ذہن ایسا صاف رکھا ہے کہ ہر افتاد کے بعد جرأتمندانہ قدم اٹھا لیتے ہیں۔ اے میری قوم! کیا تجھ سے ایسا نہیں ہوسکتا؟ کیا ہم یہود کو دیکھ کر بھی غیرت نہ پکڑیں گے؟؟؟

ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے گستاخ و بے ادب تھے اور پھر بھی خود کو اللہ کا بیٹا اور محبوب سمجھتے تھے۔ قرآن شریف میں ان پر لگائی گئی مُہر جباریت سے

نکلنے کا ایک راستہ ''**إلاّ بحبل مّن الله** '' تھا، یعنی اللہ تعالیٰ سے کسی نوع کا تعلق ورشتہ، (اس آیت میں بہت غور وفکر کے بعد ذہن اسی مطلب کی طرف جاتا ہے۔ قبول جزیہ کی تفسیر کو دل اس لیے نہیں مانتا کہ یہ تو خود بدترین ذلت ہے، اس کا ذلت سے استثناء کیسے درست ہوگا؟ اہلِ علم رہنمائی فرمائیں تو انتہائی مشکور ہوں گا) اور ندامت و پشیمانی سے بڑھ کر انسان کا اللہ تعالیٰ سے رشتہ اور کیا ہوگا؟ آج دیوارِ براق کے نزدیک اور صحراء سینا میں واقع وادیٔ طور میں یہودیوں کے اجتماعات کے دوران ان کی گریہ وزاری کو کوئی دیکھے تو تعجب ہوتا ہے، دوسری طرف شبِ قدر میں مسلمانوں کی غفلت اور دنیا میں مشغولیت ملاحظہ کر کے سینہ پھٹنے لگتا ہے۔

نظریۂ دائمی جدلیت:

ممکن ہے قارئین یہ سوال کریں یہود کے اتنے تذکرے اور قصہ خوانی سے کیا مقصد ہے؟ اس کا جواب بھی قرآن کریم سے ملتا ہے کہ مسلمانوں کو دو گروہوں سے ابدی اور دائمی دشمنی کا سامنا رہے گا (سورۂ مائدہ: آیت نمبر 82) یہ دو گروہ یہود اور ہنود ہیں، ان سے مسلمانوں کی عظیم معرکہ آرائی نوشتۂ تقدیر ہے، جسے آپ تیسری یا آخری جنگِ عظیم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور انہی دو سے لڑنے والوں کو صحیح حدیث شریف میں عظیم بشارتیں دی گئی ہیں لہٰذا مسلمانوں کو ہمہ وقت ان کی نفسیات، منصوبوں اور کارکردگی پر نظر رکھنے اور ان سے معرکے کی تیاری کئے بغیر چارہ نہیں۔ افسوس کہ یہودیوں نے مار کھانے کے بعد خود کو سنبھال لیا مگر مسلمان کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ یہود تو جھوٹے مسیح دجال کے ظہور کے لیے جملہ شرائط پوری کر کے اس کے منتظر ہیں حالانکہ وہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود اس انجام کا شکار ہوں گے جو دجال کے لیے مقدر ہے مگر مسلمان سچے مسیح سیدنا عیسیٰ علیہ السلام (جن کے ہاتھ پر تمام عیسائی مسلمان ہو کر مسلمانوں کے ساتھ ہو جائیں گے بلکہ وہ یہود بھی جو دجال کے لشکر

سے نکل آئیں گے ان کے مبارک ہاتھ پر مسلمان ہو جائیں گے) کی ہمراہی کے لیے اپنے اعمال کی درستگی اور معرکۂ عظیم کی تیاری سے غافل ہیں۔ان احوال کو دیکھ کر لگتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے علاوہ کسی اور کو مسلمان بنا کر کھڑا کریں گے جو اس کے نیک بندوں کی ہمراہی کا حق ادا کریں اور ہم یونہی منہ تکتے رہ جائیں۔"اور اگر تم (اپنے عہد سے) پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لا کھڑی کرے گا جو تمہاری طرح نہ ہوں گے۔"

سقوطِ غرناطہ کے بعد

تاریخ مسیحیت کا سیاہ باب:

سقوطِ غرناطہ کے بعد عیسائی فاتحین نے بدعہدی اور بدمعاملگی کے جو مظاہرے کیے وہ تاریخِ عیسائیت کا سیاہ باب ہیں اور عیسائی مؤرخین کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی طرح کی تاویل سے اس داغ کو دھوسکیں۔ کہاں مسلمانوں کی اعلیٰ ظرفی اور دریا دلی اور کہاں عیسائیوں کی کم ظرفی اور تنگ دلی، دونوں میں کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ عیسائیت کے کسی اصول اور مقدس مریم (علیہا السلام) سے نسبت کا کسی درجے میں بھی پاس نہیں رکھا گیا۔ تاریخِ عالم میں ظلم کے دو واقعے ایسے ہیں جن سے بدتر مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی اور دونوں کا تعلق ہسپانیہ کے متشدد عیسائیوں سے ہے۔ پہلے کا مکمل طور پر اور دوسرے کا کسی حد تک۔ یعنی سقوطِ غرناطہ کے بعد مسلمانوں کی اور امریکا دریافت کرنے کے بعد ریڈ انڈین کی نسل کشی۔ جس میں خواتین اور بچوں کا قتلِ عام، زمینوں سے بے دخلی اور ان کی زبان، ثقافت، عقیدہ اور میراث کو کلیۃً مٹانے کی کوشش کی گئی۔ سب سے بڑا ظلم مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو گرجا سے بدلنے اور مسلمانوں کو جبراً عیسائی بنانے کا تھا۔ عیسائیوں کو پہلے مقصد میں تو کامیابی

حاصل ہوگئی لہٰذا آج ہسپانیہ کے شہروں میں جو بڑا اور مرکزی کلیسا ہوتا ہے وہ کسی زمانے میں اس شہر کی جامع مسجد تھی اور شہروں سے باہر پہاڑوں اور وادیوں میں جہاں کہیں قبلہ رخ عمارت (اسپین کے اکثر شہروں کا قبلہ جنوب مشرق کی جانب ہے) پائی جاتی ہے اس کو غور سے دیکھنے پر اس کی حسرت زدہ اینٹیں بتاتی ہیں کہ وہ مسلمانوں کے سجدوں کی امانت کا بوجھ پانچ صدیوں سے اپنے زخمی سینے میں لیے مسلمان شہسواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی منتظر ہے۔ فرڈیننڈ اور ازابیلا کی قبریں بھی آج غرناطہ کے جس عظیم گرجا میں ہیں وہ درحقیقت غرناطہ کی مرکزی جامع مسجد تھی............ لیکن دوسرے مطلب میں وہ قطعاً ناکام رہے۔ ان کے بے انتہا ظلم وتشدد حتیٰ کہ اذیتیں دے کر مارنے اور زندہ جلانے کے باوجود مسلمانوں نے جلاوطن ہونا قبول کرلیا مگر اپنا مذہب چھوڑنا گوارانہ کیا۔ جدی پشتی مسلمان تو رہے ایک طرف وہ نومسلم جو ہسپانیہ کے باشندے تھے اور اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے، ان میں سے بھی کوئی خدا اور رسول سے تعلق توڑنے پر تیار نہ ہوا حالانکہ انہیں اذیتناک موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ یہی اسلام کی خوبی ہے کہ جب وہ دلوں میں گھر کر جاتا ہے تو آگ میں کودنا آسان لگتا ہے لیکن جس رَبّ کا کلمہ پڑھا اس سے غداری کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ آج اس گئے گزرے دور میں بھی اسلام کا یہ معجزہ ظاہر ہوکر رہتا ہے اس لیے دنیا بھر میں پھیلی ہوئی عیسائی مشنریوں کے اخراجات اور مسلمانوں کو مرتد بنانے کی کامیابیوں میں تناسب ڈھونڈا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسلمان ان کے جال میں پھنس کر گناہ گار تو ہوسکتا ہے لیکن اسلام کی محبت اس کے دل سے نہیں نکالی جاسکتی، اس لیے اب یہ مشنریاں مسلمانوں کو عیسائی بنانے سے زیادہ زور انہیں عیسائیت زدہ مسلمان بنانے پر خرچ کرتی ہیں۔

نئی دنیا:

البتہ اسپین میں مقیم ایک قوم ایسی تھی جو مسلمانوں کی طرح سادہ دل اور صاف گو ہونے

کی بجائے انتہائی گھنی اور دوغلی تھی۔ ان کے لیے مذہب کی تبدیلی کوئی مسئلہ نہ تھی، یہ یہود تھے جن کے ہاں جھوٹ اور فریب، عیب نہیں بلکہ خوبی اور کمال سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دیتے ہوئے بھی اپنی اس خصلت کے اظہار سے نہیں شرماتے۔ مثلاً: ان کے ہاں اپنے بچوں میں ''ارضِ موعود'' کی طرف واپسی کا جذبہ زندہ رکھنے کے لیے یہ جملہ دہروایا جاتا ہے: ''اگر میں یروشلم کو بھول جاؤں تو میرا بایاں ہاتھ فریب کو بھول جائے۔'' یعنی مقدس شہر کے حصول کی کوشش اور اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے دھوکہ فریب ایک جیسی چیزیں ہیں۔ ہسپانیہ کے عیسائی فاتحین مسلمانوں سے زیادہ یہود کے دشمن تھے لہٰذا سقوطِ غرناطہ کے ساتھ ہی وہ یہود جو مسلمانوں کی سلطنت میں محفوظ و مامون رہتے تھے، ان کو جان کے لالے پڑ گئے۔ فرڈینڈ اور ازابیلا نے غرناطہ کے سقوط کے وقت کیے گئے معاہدہ کے صرف تین ماہ بعد ہی ان کو عیسائیت قبول کرنے یا پھر اسپین کی سرزمین سے دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سازشی دفعان ہو جائیں گے تو قوم محفوظ و متحد رہے گی ورنہ ان کی تخریبی فطرت کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرتی رہے گی۔ اس موقع پر جو یہودی سلطنتِ عثمانیہ جا سکتے تھے وہ تو اپنے مال و اسباب کے ساتھ مسلمانوں کے اس ملک میں پہنچ گئے اور امن و امان سے رہنے لگے کیونکہ روزِ اول سے مسلمانوں کی خوبی چلی آئی ہے کہ وہ قیدیوں اور ذمیوں (دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں) کے ساتھ انتہائی فراخدلانہ سلوک کرتے رہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس حوالے سے کوئی قوم ان کی برابری نہیں کر سکتی۔ یہود کا دوسرا گروہ انگلش چینل (جسے مسلمان جغرافیہ دان بحرِ انقلطرہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ انقلطرہ انگلینڈ کی بگڑی ہوئی شکل ہے) پار کر کے انگلستان پہنچ گیا، تیسرے نے سمندر پار دریافت شدہ نئی دنیا ''امریکا'' کی راہ لی۔ جنوری 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کا سانحہ ہوا۔ اپریل 1423ء میں کولمبس کی مہم روانہ ہوئی ہے اور 12 اکتوبر 1492ء کو کولمبس عرب جہاز رانوں کی رہنمائی میں نئی دنیا تک پہنچا ہے۔

سامری شعبدہ باز:

یہود پر چونکہ مسیحی ہسپانیہ کی سرزمین تنگ ہوگئی تھی اس لیے وہ نیا براعظم دریافت ہوتے ہی اپنا سودی سرمایہ سمیٹ کر دھڑا دھڑ امریکا پہنچنے لگے، ان میں یہ خیال بھی زور پکڑ گیا تھا کہ دجال شاید اسی سرزمین میں کہیں مقید ہے اور اس کی مدد سے وہ دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرلیں گے۔ جو وہاں نہ جاسکتے تھے انہوں نے عیسائی مذہب ''قبول'' کرلیا۔ یہ لوگ 300 سال تک عیسائی بنے رہے اور جیسے ہی جنونی عیسائیوں کا دور ختم ہوا یہ لوگ سامری شعبدہ بازوں کی طرح عیسائیت کا چوغہ اتار کر اندر سے دوبارہ اصل حالت میں برآمد ہوگئے۔ ان کے جوق در جوق عیسائیت قبول کرنے کے زمانے کا ایک واقعہ مشہور ہے جس سے ان کی شاطرانہ ذہنیت کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غرناطہ کے ایک کلیسا میں جب ان کو قبولِ عیسائیت کی رسم ادا کرنے کے لیے جمع کیا گیا تو وہ شام کا وقت تھا۔ عیسائی پادریوں کو جو مسیحیت کے پھیلنے پر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، کامیابی اور مسرت کے نشے میں کچھ دیر ہوگئی۔ اس پر وہاں جمع شدہ یہودی خاندان برا منانے لگے۔ جب اس ناراضگی کی وجہ کی کھوج کی گئی تو پتہ چلا کہ یہودی مذہب کے مطابق ان کی شام کی دعا کا وقت تنگ ہو رہا تھا اس لیے وہ مسیحیت قبول کرکے جلدی سے یہودی دعا کے لیے اپنے گھروں میں بنائے گئے عبادت خانوں میں پہنچنا چاہتے تھے۔

محسن کُش قوم:

سلطنت عثمانیہ اور براعظم امریکا میں پہنچنے والے یہودیوں نے اپنے محسنوں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ان کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ عثمانی سلاطین نے انہیں اس وقت پناہ دی جب یہ اسپین سے لُٹ پٹ کر آئے تھے اور ان کو کہیں جائے پناہ نہ ملتی تھی مگر انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کے سقوط میں بنیادی کردار ادا کیا۔ جنگِ عظیم اول کے دنوں میں ان کا ایک

وفد سلطان عبدالمجید خان سے ملا اور فلسطین میں یہودی ریاست کے لیے جگہ چاہی اور اس کے عوض سلطنت کے سارے قرضے (سلطنت عثمانیہ اس وقت جنگی اخراجات اور بے جا خرچ کی وجہ سے زیر بار تھی) اپنے پاس سے ادا کرنے کی پیشکش کی۔ سلطان کی رگوں میں اس کے مجاہد آباء واجداد کا خون دوڑ رہا تھا۔ یہودیوں نے جب زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے تھوڑی سی زمین کھرچی اور یہودی وفد سے کہا: "فلسطین کی سرزمین میری ذاتی ملکیت نہیں، یہ جگہ میرے آباء واجداد نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد کے ذریعے حاصل کی تھی۔ اگر تم اس ساری دولت کے بدلے فلسطین کی اتنی سی مٹی مانگو گے تو میں وہ بھی تمہیں نہ دوں گا۔" یہودیوں نے یہ مایوس کن جواب سننے کے بعد اتحادی افواج سے ساز باز کی اور جنگ میں برطانیہ کی مالی مدد کے عوض جنگ کے اختتام پر فلسطین اپنے نام لکھوالیا۔ اس معاہدے کو اعلان بالفور کہتے ہیں۔ بعد کی کہانی سب کو معلوم ہے کہ قرہ صوہ آفندی نامی جوتر کی یہودی برطانوی افواج کی طرف سے سقوطِ خلافت کا پروانہ لے کر سلطان کے پاس گیا وہ اسی یہودی وفد کا سربراہ تھا جس نے لالچ دلا کر ارضِ فلسطین خلافتِ عثمانیہ سے لینی چاہی تھی اور ترکی سے اسلامی روایات کا نام ونشان مٹانے کی کوشش کرنے والا مصطفیٰ کمال جسے "ترکوں کے باپ" کا لقب دلوایا گیا، انہی راندہ درگاہ یہودیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ تھا یہودیوں کا اپنے محسن کے ساتھ جوابی سلوک لیکن اس پر اتنی حیرت نہیں، حیرت اس پر ہے کہ مسلمانوں نے انگریز کی زیادتیاں اتنی جلد کیسے بھلا دیں۔

جہاد اور جدوجہد میں فرق:

اس وقت کشمیر اور فلسطین کا مسئلہ مسلم دنیا کے زخموں میں سب سے زیادہ گہرا گھاؤ ہے اور یہ دونوں تحفے اسے انگریزوں نے جاتے جاتے دیے ہیں۔ مسلمان ہسپانیہ سے نکلے تو آج وہاں قسم کھانے کی حد تک بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا کوئی نہیں، لیکن انگریز جہاں سے

نکلے وہاں ان کے پیدا کیے ہوئے خلفشار آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں اور زیادہ تر ممالک میں ان کے پروردہ اور پس خوردہ چاٹنے کے شوقین دیسی انگریز برسرِ اقتدار ہیں۔ یہ فرق اس لیے پیدا ہوا کہ اسپین کا سقوط بزورِ شمشیر ہوا تھا جبکہ انگریزوں کے زیر قبضہ مسلم ممالک سے ان کا اخراج جہاد سے نہیں، جدوجہد سے ہوا تھا اور اللہ پاک نے تلوار کے علاوہ ایسی کوئی چیز پیدا نہیں کی جو مکمل تصفیہ کا کام کر سکے لہٰذا ہسپانیہ سے مسلمانوں کے ساتھ اسلام بھی رخصت ہوا جبکہ برطانوی مقبوضات سے انگریز تو نکل گئے مگر انگریزیت آج تک باقی ہے اور اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ افسوس کہ آج ہسپانیہ کا ایک بچہ بھی اگر موروں کا نام سنے تو مقدس مریم کا نام لے کر سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگتا ہے لیکن ہماری قوم میں سے کسی کے دل میں گورے دشمن کی نفرت یا اس کے مظالم کا انتقام لینے کی دھن نہیں بلکہ ہمارے کالے انگریز صاحبان آج بھی اس عیار اور فتنہ باز قوم کو اپنا آئیڈیل سمجھ کر اس کے طور طریقے اپنے بچوں کو سکھانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ سارا فرق مانگ کر لینے اور چھین کر حاصل کرنے کا ہے۔ اگر انگریز کو جہاد کے ذریعے نکالا جاتا تو صورت حال ہرگز ایسی نہ ہوتی۔ اگر کسی کو جہاد کی حقانیت اور افادیت سمجھنی ہو تو یہی ایک مثال کافی ہے۔ بہر حال یہ کارگزاری تو سلطنتِ عثمانیہ کی طرف نقل مکانی کرنے والے یہود کی تھی۔ بحر اوقیانوس پار کر کے امریکا پہنچنے والے یہود کی ہوشربا کارستانیاں بھی کچھ کم نہیں۔

آیئے! ذرا ایک نظر ان پر بھی ڈالتے ہیں کہ ہماری گردوپیش کی دنیا کا ان سے گہرا تعلق ہے۔

سقوطِ غرناطہ سے سقوطِ بغداد تک

واقعات دونوں بظاہر الگ الگ ہیں لیکن ان میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ اگرچہ دونوں حادثات کے بیچ تقریباً پانچ صدیوں کا فاصلہ ہے لیکن اسباب وعوامل کا تسلسل مجبور کرتا ہے کہ دونوں سانحے ایک ہی شجرۂ خبیثہ سے پھوٹنے والے دو نامبارک ثمر قرار دیے جائیں۔ سقوطِ غرناطہ عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ اور اس کی عیسائی ملکہ ازابیلا کے ہاتھوں ہوئی۔ سقوطِ بغداد امریکی صدر جارج بش اور ان کی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس جیسے مشیروں کے ہاتھوں انجام پایا۔ یہ دو الگ الگ براعظموں میں صدیوں کے فاصلے سے پیش آنے والے دو الگ الگ واقعات ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو دونوں میں قاتل بھی ایک تھا، مقتول بھی ایک، وجہ قتل بھی ایک ...... یہاں تک کہ آلۂ قتل اور وارداتِ قتل بھی یکساں ہی ہے۔ جہاں تک اس راز کے اجمال کا تعلق ہے تو وہ اتنا ہے کہ امریکا ان عیسائی فاتحین اندلس کی باقیات میں سے ہے، جنہوں نے تیس لاکھ اندلسی مسلمانوں کو قتل کیا تھا اور امریکی اس خون آشام عفریت کی ذریت میں سے ہیں جس کی سرشت میں عیسائی انتہاپسندی اسلام دشمنی، مسلم کشی، مسلمان ریاستوں پر تسلط جمانے کی حرص وہوس رچی بسی ہوئی ہے اور جہاں تک

اس اجمال کی تفصیل کا تعلق ہے اس کے لیے ہمیں پانچ صدیاں پیچھے جانا پڑے گا۔

1492ء اقوامِ عالم کی تاریخ میں وہ سال ہے جس میں تاریخ عالم کے دو اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ ان دونوں واقعات کا تعلق ایک قوم کے زوال اور دوسری کے عروج سے ہے۔ ان دونوں کے نتیجے میں عیسائی تعصب اور صہیونی عداوت کو وہ عروج ملا جو آج تک زوال زدہ مسلمانوں کے تعاقب میں ہے اور پانچ صدیوں کا عذاب کاٹنے کے باوجود ان کی جان حزیں کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہیں۔

اسی سال ہسپانیہ میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کا سورج غروب ہوا اور امریکا کی دریافت کا چاند چڑھا اور یہ دونوں تاریخی واقعات ایک ہی انتہا پسند عیسائی خاتون سے وابستہ ہوئے۔ 1492ء کا سال شروع ہوتے ہی ملکہ ازابیلا کی تمنا بر آئی اور اسپین میں مسلمانوں کے خلاف اس کی طویل جدوجہد کامیاب ہوگئی۔ 1492ء کے آخر آخر اس کے بحری مہم جوؤں نے شمالی امریکا دریافت کر کے ایک نئی دنیا، ایک پورا براعظم ملکہ ازابیلا کی ملکیت میں دے دیا۔ سو ایک ہی سال میں ازابیلا کو ملنے والی دو بڑی کامیابیوں نے آنے والی کئی صدیوں کے لیے انسانیت کو شرمسار اور لہولہان کر دیا۔

دو جنوری 1492ء کی سہ پہر اندلس کے مسلمانوں پر بہت بھاری تھی۔ یہ سقوط کی پہلی شام تھی۔ کلمہ گوؤں پر ابتلا کی طویل رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ غرناطہ کی کشادہ مسجدیں ملکہ ازابیلا اور فرڈی نینڈ کے عیسائی لشکریوں اور گھوڑوں کے پیشاب سے متعفن ہو رہی تھیں۔ مسجدوں کے صحن ان کے فوجی ساز و سامان اور ہتھیاروں سے لدے ہوئے خچروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس شام غرناطہ میں اذان کی بجائے ہر طرف سے مسلمانوں کی آہ و بکا سنائی دیتی تھی یا شراب سے مدہوش، جشن فتح مناتے ہوئے عیسائی لشکروں کے ہنکارے۔ غرناطہ میں جگہ جگہ آگ لگی تھی جس میں قرآن پاک، نادر کتابیں اور نایاب قلمی نسخوں کی

صورت میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی میراث کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ عبدالرحمٰن الداخل کے قائم کردہ مرکزی کتب خانے کی تین لاکھ سے زیادہ جلدوں کے جلنے سے غرناطہ میں ایسا کثیف دھواں چھا گیا کہ جس کی سیاہی مسلمانوں کی سیاہ بختی سے ہرگز کم نہیں تھی۔ مسلمانوں کی بے چارگی کا یہ عالم تھا کہ شرعی ریش سے آراستہ چہرے آہ وفغاں کرتے۔ روتے، سسکیاں بھرتے۔ آنسوؤں سے تر بتر بھیگی ڈاڑھیوں سمیت غرناطہ کے بازاروں میں عیسائیوں کے نعرے سنتے رہتے۔ ذلت، رسوائی، بے چارگی اور خون خرابے پر تباہی و بربادی مسلط ہوگئی۔ مسلمانوں پر ایسا کڑا وقت پڑا تھا کہ وہ کسی طرح بھی محفوظ نہیں تھے۔ بے آبروئی ایسی ہوئی کہ زمین شق ہو کہ آسمان ٹوٹے۔ عفیف و پاکدامن مسلمان عورتیں جو اپنے نامحرموں سے بھی فاصلے اور پردے پر رہتی تھیں، برہنہ سر اور ننگے پاؤں غرناطہ کے گلی کوچوں میں پناہ کی تلاش میں بے سمت بھاگی پھرتی تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے مدہوش عیسائی لشکری اپنے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ جب وہ بھاگتی ہوئی ان سراسیمہ و بدنصیب عورتوں کے سروں پر پہنچ جاتے تو منہ بھر بھر ان پر شراب کی کلیاں کرنے لگتے۔

1492ء میں اندلس کی آخری مسلمان حکومت کے سقوط کے ساتھ ہی ملکہ ازابیلا نے اپنی سلطنت کو دور دراز تک وسعت دینے، شاہی خزانے کو بھرنے اور ہوس ملک گیری کی تسکین کی خاطر کولمبس کے نئی دنیا کے دریافت کے منصوبے پر بات چیت کے لیے اسے شرفِ ملاقات بخشا۔ کولمبس نے اس سے وعدہ کیا:

''میں جو بھی علاقے اور ملک دریافت یا فتح کروں گا وہاں پر عیسائیت پھیلانے کا کام صدقِ دل اور پوری کوشش سے کروں گا۔ میں نامعلوم زمینوں پر عیسائیت کا نمایندہ بن کر اور عیسائی چرچ کا پیغام لے جانا چاہتا ہوں۔ میں دریافت کردہ ملک سے ہونے والی آمدنی کا معقول حصہ یروشلم میں مسلمانوں سے عیسائی معبدگاہوں کی بازیافت میں خرچ

کرنے کا مضبوط ارادہ رکھتا ہوں۔'' کولمبس کے خیالات پر ملکہ ازابیلا فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھی اور بے ساختہ کہا: ''اگر اس بحری مہم کے لیے مجھے اپنے جواہرات بھی رہن رکھنا پڑیں تو میں دریغ نہیں کروں گی۔''

17 اپریل کو غرناطہ میں اس مشہور عالم معاہدے پر دستخط ہوئے جس کی رو سے کولمبس امیر البحر اور نئی دریافت ہونے والی دنیا میں ملکہ ازابیلا کا وائسرائے مقرر ہوا۔ (دیکھیے: منسلکہ عکس) اس معاہدے نے نئی دنیا کی دریافت کی بحری مہم کے لیے کولمبس کو تین بحری جہاز، سونے کے دو ہزار سکے، سو ملاح اور فوجی، سیاسی و قانونی تحفظ فراہم کر دیا۔ چھ ماہ کی مختصر مدت میں اسی معاہدے کے بطن سے امریکا کی دریافت نے جنم لیا۔ یوں ملکہ ازابیلا کی خون آشامی، اس کی سرشت میں رچی ہوئی بے رحمی، اسلام دشمنی، سرمایہ داری، انسانی خون کی منہ لگی لذت اور نسل کشی کا تجربہ جو اسے اندلس کے مسلمانوں کی نسل کشی سے حاصل ہوا تھا، اسپین سے امریکا پہنچ گیا۔ پندرہویں صدی کے آخر آخر اگر اندلس کے مسلمان حکمران اس قدر کمزور نہ ہو گئے ہوتے اور مزید کچھ عرصہ مسلم اقتدار قائم رکھ سکتے تو کیا عجب کہ کولمبس کو اپنی درخواست کسی مسلمان امیر کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی اور امریکا کا نیا براعظم مسلم اقتدار سے وابستہ ہوتا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا

جس امریکا کی دریافت پر ملکہ ازابیلا جیسے اسلام دشمن کی مہر ثبت ہے اس امریکا سے مسلم اُمہ کو نقصان تو پہنچ سکتا ہے جو کہ پہنچ رہا ہے لیکن وہ فائدہ جس کی توقع مسلمان حکمرانوں نے امریکا سے وابستہ کر رکھی ہے، کبھی نہیں ہوگا۔ امریکا کی ساخت اور سائیکی ہی اپنی ہیئت ترکیبی میں مسلمانوں کے خلاف اور ناحق خونِ مسلم پر استوار ہے اسے کسی بھی

طرح مسلم اُمہ کے حق میں رام نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کو جب بھی پہنچے گا امریکا سے
نقصان ہی پہنچے گا۔ مسلمانوں کے حق میں امریکی حمایت کی بیل کا منڈھے چڑھنا ممکن ہی
نہیں ہے۔ امریکی دریافت کے پس منظر میں ملکہ ازابیلا کی اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی
ہزیمت اہم ترین عنصر کے طور پر کارفرما ہے۔ اس کیمسٹری کو بدلا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا امریکا کی
اصل کے اجزائے ترکیبی کی رو سے امریکا کے ہاتھوں مسلمانوں کی ہزیمت اور مسلم اُمہ کا
قتلِ عام کسی اچنبھے کا باعث ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اچنبھا تو اس بات پر ہوتا کہ اگر امریکا
کے ہاتھوں مسلمان اور مسلم اُمہ محفوظ رہے ہوتے۔ امریکا کی نظریاتی اساس پاپائیت،
یہودیت اور عیسائیت کے اس انتہا پسند اور دہشت گرد نظریے پر استوار ہوئی ہے۔ یہ طے
ہے کہ ریاستیں جس نظریہ اور اُصول پر قائم ہوتی ہیں انہیں جھٹلانے اور ان سے جان
چھڑانے کی کوشش کے باوجود وہ نظریہ ریاست کی مٹی اور پانی میں، زمین کی شریانوں میں،
لب و لہجے میں اور ثقافت و سائیکی میں بہرحال موجود رہتا ہے تو امریکا اس اُصول سے
کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ امریکا کی نظریاتی بنیاد ملکہ ازابیلا کی اسلام دشمنی، مذہبی دہشت
گردی اور عیسائیت کے حق دریافت پر استوار ہوئی تھی۔ سو اب امریکا سے دس بیس
مسلمان حکمرانوں کو خیر کی توقع ہو تو ہو...... لیکن مسلم اُمہ کے حق میں کبھی ادنیٰ درجہ کی خیر کا
باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی کو افغانستان اور عراق میں ہسپانوی عیسائی انتہا پسندی کے
اثرات اور اس مسلم دشمن نظریے سے وابستہ دہشت گردی نظر نہیں آتی جو سقوطِ غرناطہ کا
سبب بنی تو اس کورچشمی کی جو بھی وجوہات ہوں لیکن تین صدیوں کے امریکی تمدن سے
صرف اسی قدر تبدیلی آئی ہے کہ دشمن کش مہم میں آزادی اور جمہوریت کے لفظ شامل
کر لیے گئے ہیں۔ عالمی برادری کے انسانی حقوق کی رواداری میں اب عیسائیت کی
بجائے آزادی اور جمہوریت کا بپتسمادیا جاتا ہے۔

ملکہ ازابیلہ نے 1502ء میں جن حلقوم پر غیر انسانی افعال کا آرا چلانے کی بنا ڈالی تھی پانچ سو سال بعد وہی حلقوم ایک بار پھر اسی آرے تلے آ چکے ہیں۔ صدر جارج بش واکر کی امریکی افواج نے عراق میں بعینہٖ وہی کیا جو ازابیلا کی جاہل سپاہ نے غرناطہ میں کیا تھا۔ دونوں کی زد مسلمانوں کی علمی میراث، تہذیبی ورثے اور مسلم اُمہ کے قلب پر پڑی۔ ملکہ ازابیلا کے اسلام دشمن اور مسلم کش رویے کے بارے میں شیخ منظور الٰہی ''نیرنگ اندلس'' میں لکھتے ہیں: ''غرناطہ میں دوسو پبلک لائبریریاں اور ایک درجن رہائشی مکان ایسے تھے جہاں بیش بہا کتابوں اور مخطوطات کا ذخیرہ تھا جن میں قرآن کریم کے ہزارہا نسخے اور عالمانہ تفسیریں تھیں۔ طب اور علم افلاک پر نادر کتابیں تھیں۔ فلسفے کی کتابوں میں ابن رشد کے نایاب متون شامل تھے۔ ایسے گوہر آبدار صدیوں کی ذہنی کاوش کا ثمر ہے جن کی ترتیب وتزئین میں سینکڑوں کاتب، نقاش، زرکوب اور جلد ساز برسوں منہمک رہے تھے۔ کتابت میں آب زر استعمال ہوا تھا۔ حاشیے میں کہیں بیل بوٹے اور گلکاری تھی کہیں متنوع رنگوں کا فشار۔ یکم دسمبر 1499ء کو حملہ آوروں نے اس میراث پر ہلہ بول دیا۔ وہ صدیوں کی عقل ودانش کا نچوڑ ریڑھیوں میں ڈال کر لے گئے۔ کتابوں کے پشتاروں تلے اُجڈ سپاہیوں کی پشت تھی۔ دن بھر باب الرملہ کے تلے کتابوں کے انبار ایک پہاڑ کی شکل اختیار کرتے رہے۔ لوگوں کو تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا کیا گیا۔ غم وغصہ سے چور مسلم میں خون اُترا ہوا تھا۔ چہرے نفرت وحقارت کا مرقع تھے۔ کچھ خالی الذہن ہو کر فضا میں تک رہے تھے۔ اشارہ پا کر الاؤ روشن کیا گیا۔ جہنمی شعلے آسمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ ثانیہ دو ثانیہ کربناک سناٹا تھا۔ پھر صدیوں کا علمی خزینہ خاکستر ہوتا دیکھ کر افسردہ مجمع سے دلدوز چیخیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی ازلی وابدی صداقت کے اثبات میں اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ گونجا۔ مجمع چھٹنے لگا۔ نیلگوں آسمان پر ٹانکے ہوئے ستارے سلگتے اوراق کو بھسم ہوتا دیکھا

کیے۔قرطبہ،اشبیلیہ اور دوسرے شہروں میں حاکموں اور پادریوں نے ایسی لاکھوں کتابیں جلا ڈالیں۔اس پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے معاصر امریکی ناول نگار جیمز مچز کہتا ہے:
''تاریخ اور علم کے خلاف یہ ایک گھناؤنا جرم تھا۔سقوطِ غرناطہ کو کئی برس گزر چکے تھے۔اس وقت آتش انتقام سرد پڑ جانی چاہیے تھی، ایسا بیش بہا علمی ذخیرہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

تعصب، جہالت اور تنگ نظری کا یہ منظر تو پانچ سو سال پرانا تھا۔اب جبکہ امریکا کا علم چاند پر اور کمند خلاؤں پر ہے۔علم و آگہی کا سورج نصف النہار پر ہے۔اس کی ترقی کی چکا چوند سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔بھیڑ اور بھیڑیے رواداری اور حسن سلوک کے ایک ہی پتن پر پانی پی رہے ہیں اور انسانی حقوق کی بلّے بلّے ہو رہی ہے......لیکن اسلام اور علم دشمنی میں امریکی رویہ ملکہ ازابیلا کے رویے سے مختلف نہیں ہے۔افواج ازابیلا نے تو غرناطہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ علمی میراث کو نذرِ آتش کیا تھا لیکن افواج جارج بش نے عراق کے سات ہزار سالہ تاریخی وتہذیبی ورثے کو خاکستر کر دیا۔

پانچ اپریل 2003ء کو جب امریکا کی فاتح افواج بغداد میں داخل ہوئیں تو اس داخلے کی بدترین زد نیشنل آرکائیو بغداد، قرآنی لائبریری بغداد، نیشنل میوزیم بغداد، موصل آرکائیو اور موصل لائبریری پر پڑی۔تاریخ،علم اور تہذیب کے ان مراکز سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں نے غرناطہ کے باب الرملہ کی یاد تازہ اور زخم ہرے کر دیے۔ڈیلی ٹیلی گراف لندن کے نامہ نگار ڈیوڈ بلیئر راقم طراز ہیں:''عراق کے نیشنل میوزیم کی تباہی سے ہزاروں سال کی تاریخ اور تہذیبی ورثہ ملبے کی صورت پاؤں میں نیچے آ چکا ہے۔دنیا کا عظیم الشان علمی وتہذیبی ذخیرہ بغداد میں امن وامان کی بدترین صورت حال کی نذر ہو گیا ہے۔سات ہزار سالہ مصدقہ تاریخ کے حامل ملک کا اپنے ماضی سے ناقابلِ تلافی حوالہ ٹوٹ چکا ہے۔ایک

لاکھ ستر ہزار نوادرات، دستاویزات، ظروف، نمونے، نقشے، تصویریں، قلمی نسخے اور قلمی قرآن شریف جلا دیے گئے ہیں یا لوٹ لیے گئے ہیں۔ نیشنل میوزیم سے صرف ایک میل کی دوری پر عراق کی قومی لائبریری کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا ہے جس سے عراق کا تہذیبی ورثہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہے جس کی کسی بھی قیمت پر تلافی ممکن ہی نہیں ہے۔''

مشہور دانشور، مصنف اور عالمی ماہر آثار قدیمہ فرنینڈ و بائیز کہتے ہیں: ''1258ء میں منگولوں نے بغداد میں جس طرح علمی و تہذیبی ورثے کو نذرِ آتش کیا تھا، اس کے بعد سے یہ انسانی تمدن، تاریخ، علم اور تہذیب پر سب سے بڑا حملہ ہے۔ یہ بہت بڑا ثقافتی اور تمدنی قتل ہے جو امریکیوں کے ہاتھوں ہوا ہے۔ کم از کم دس لاکھ کتابیں، نوے لاکھ دستاویزات اور چودہ ہزار تاریخی تختیاں لوٹی اور جلائی جا چکی ہیں۔ امریکا اور پولینڈ کے فوجی اس نایاب ورثے کو اردن اور کویت کے سرحدی علاقوں میں آرٹ کے عالمی بیوپاریوں کو بیچ رہے ہیں۔ آرٹ کے یہ بیوپاری ایک سیمیرین تختی پچاس ہزار ڈالر سے زیادہ میں خرید لیتے ہیں۔''

روزنامہ ڈان اس سفا کی کی مذمت کرتے ہوئے اپنے اداریے میں لکھتا ہے:

''بغداد اور موصل کے عجائب گھروں کی لوٹ مار اور نیشنل آرکائیوز اور قرآنی لائبریری کی آتش زدگی نے منگولوں کے ہاتھ بغداد میں اسلامی تاریخی ورثے کی تباہی کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ضائع ہو جانے والے فن پاروں میں بابل، کالخو، نینوا، اُر، اسیرین اور پرشین تہذیب کے نوادرات بھی شامل تھے جبکہ بغداد کے عین وسط میں وزارتِ پیٹرولیم حیران کن حد تک محفوظ رہی چونکہ اسے مکمل طور پر محفوظ کر لیا گیا تھا۔ ضائع ہو جانے والے ظروف کی تعداد سے اختلاف کرتے ہوئے امریکی سیکرٹری دفاع رمزفیلڈ نے طنزیہ حقارت سے کہا ہے کہ ایک لاکھ ستر ہزار! غالباً اتنے ظروف تو پورے عراق میں بھی نہیں ہوں گے۔''

کچھ ہی دنوں میں عراق سے امریکا واپس پہنچنے والے امریکی فوجیوں کے سامان سے ''ضائع'' ہو جانے والے نوادرات برآمد ہونا شروع ہو گئے۔ یہ طمع، ہوس، مفادات اور سرمایہ داری کی وہ ہسپانوی لت ہے جس نے براعظم امریکا پہنچتے ہی پہلے شمالی اور جنوبی امریکا میں صدیوں میں سے بسنے والے 100 ملین ریڈ انڈینز کا لہو چاٹ لیا۔ 60 ملین افریقن غلاموں کا خون پیا۔ بعدازاں اقوامِ عالم کے سروں پر موت بن کر سایہ فگن ہو گئی۔

میکسیکو، کیوبا، گوئٹے مالا، پانامہ، گرینیڈا، کوریا، کمبوڈیا، ویت نام، چین، جاپان، کانگو، سوڈان، صومالیہ، انڈونیشیا، لیبیا، لبنان، مشرقی تیمور، یوگوسلاویہ، لاؤس افغانستان اور عراق......اب مسلم اُمہ اسی عفریت کے خونی جبڑوں میں ہے۔ مسلمان اس کا سب سے بڑا اور سب سے آسان شکار ہیں۔ مسلم اُمہ اس کے پنجے میں مقید، چھینٹوں چھینٹ اور لہولہان ہو چکی ہے۔ امریکا کی مختصر مگر تشدد آمیز اور جارحیت بھری تاریخ سے عبرت نہ لینے اور سبق نہ سیکھنے کی مسلمان حکمرانوں کی جو بھی وجوہات ہوں مگر تاریخ کی شہادت، قرائن اور آثار کہتے ہیں کہ عراق کے بعد اگلا ہدف ایران اور پھر ہم ہوں گے۔

احیائے عیسائیت کے جس خبط نے ہسپانیہ میں غلبہ حاصل کیا تھا، ہسپانیہ سے امریکا پہنچنے تک اس کی شدت میں مالی منفعت، گروہی مفادات اور انفرادی لوٹ مار بھی شامل ہو چکی تھی۔ افغانستان اور عراق میں بیک وقت امریکی جارحیت کی طرح مزید اسلامی ممالک امریکی جارحیت کا نشانہ بن جائیں گے۔ خصوصاً پاکستان مستقلاً بھنور کی آنکھ میں ہے۔ ہمارا قصور وہی ہے جو غرناطہ کے مسلمانوں کا تھا، جو عراق وافغانستان کے مسلمانوں کا ہے۔ جرمِ ضعیفی کی سزا بھگتتے بھگتتے ہمیں پانچ صدیاں بیت چکی ہیں لیکن ہم سمجھ کے نہیں دے رہے لہٰذا سزا ابھی کٹ کے نہیں دے رہی۔

وطنِ عزیز پاکستان میں قوم کا مورال بلند کرنے کے لیے سال میں ایک آدھ مرتبہ

جو تھوڑی بہت نمائش اور پریڈ ہوتی تھی اس میں خیر سے پہلی مرتبہ نرسوں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔امریکی عفریت جبڑے کھولے سر پہ آن پہنچا ہے اور ہمارے لچھن ایسے ہیں گویا (خاکم بدہن) کسی اور سقوط کے منتظر ہیں۔

ہمیں آج کل اس بات پر غم ہے کہ کرکٹ ٹیم کے یہودی کوچ (سابقہ فزیو تھرپسٹ بھی یہودی تھے) کی قتل نما موت نے پاکستان کرکٹ پر چھائے بادل مزید گہرے کردیے ہیں۔

اللہ ہی ہماری حالت پر رحم کرے کہ ہمارے کرتوت الحمرا کے باسیوں جیسے اور ہماری اُمیدیں ازابیلا کی اس آل سے ہیں جس کی مہربانیوں کے طفیل ہم اس حالت تک پہنچے ہیں۔

شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر

''تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے'' یہ مقولہ بارہا سنا لیکن تاریخ کا یہ پھیرا اتنی یکسانیت کے ساتھ، اتنا واضح اور دوٹوک بھی ہوتا ہے؟ اس کا ہمیں اس سے پہلے اندازہ نہ تھا۔

صدر پرویز مشرف نے کہا ہے: ''بین الاقوامی برادری دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارے کردار پر شک نہ کرے۔ جنوبی وزیرستان میں قبائلیوں نے جھڑپوں میں 300 غیر ملکی دہشت گردوں کو ہلاک کیا ہے۔ اگر آئی ایس آئی اور پاکستان جھوٹ بول رہے ہیں تو ہمارا دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد سے علیحدہ ہونا ہی بہتر ہے۔ افغانستان کی جانب سے لگائے گئے الزامات کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان پر شک نہ کیا جائے۔''

صدر پرویز کا یہ بیان پڑھ کر نجانے ذہن کیوں اس خط کی طرف چلا جاتا ہے جو ہسپانیہ کے آخری مسلم حکمران ابوعبداللہ کو عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ کی طرف سے بھیجا گیا: ''ہم تمہارے شکرگزار ہیں کہ تم ہمارے لیے خدمات انجام دیتے رہے ہو۔ ہم تمہاری خدمات تسلیم کرتے ہیں۔ تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔ ہم تمہیں اپنی

سرپرستی میں لے چکے ہیں اور یہی بات بذات خود قابلِ اطمینان ہونی چاہیے کہ تم ہماری حفاظت میں ہو لیکن اس کے باوجود تم نے ابھی تک وہ سب کچھ نہیں کیا جس کی اُمید دلائی گئی تھی۔ اس طرح تم معاہدے سے پھر رہے ہو جبکہ تمہیں خدمات سونپنے میں معاہدے کی تکمیل کو ملحوظ رکھا گیا تھا لیکن تمہاری طرف سے معاہدے پر عدم عملدرآمد معاہدے سے انحراف کے مترادف ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم ہماری مدد کے ساتھ شہر (غرناطہ) میں خاطر خواہ اثر ڈال سکتے ہو جو کہ ابھی تک ظاہر نہیں ہوا۔ تمہیں اس خطیر انعام کے بارے میں بتا دیا گیا تھا جو اس کام کی تکمیل پر تمہاری خدمات کے معاوضے میں تمہیں دیا جا سکتا ہے۔''

کچھ دنوں بعد اس کے گورنر ابوالقاسم عبداللہ کو فرڈی نینڈ کے ایک معتمد خاص کا خط موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا: ''میرے بھائی! مجھے تمہارا یہ خط پڑھ کر دکھ ہوا اور میں حیرت زدہ رہ گیا ہوں کہ تم میرے خلاف شکایات کر رہے ہو حالانکہ میں نے تم سے ہر ممکن بہترین سلوک کا رویہ اختیار کیے رکھا ہے۔ اب میں تمہیں ضمانت نہیں دے سکتا کہ تمہارے اقدامات کی تحسین کی جائے گی اور تم پر یقیناً رحم کیا جائے گا۔ اس کا دارومدار تمہیں سونپی گئی خدمات کی تکمیل پر ہی ہوگا۔''

تاریخ کے صفحات اور ہسپانیہ کے عجائب گھروں میں محفوظ یہ دونوں خطوط ایسے ہیں کہ ان کو کم از کم اسلامی ملکوں کے حکمرانوں کو اپنے لیے مثال اور معیار سمجھنا چاہیے کہ آج بھی ان پر رحم اور تحسین کا دارومدار ان کو سونپی گئی خدمات کی تکمیل سے ہی وابستہ ہے۔ جنرل محمد ایوب خان سے جنرل پرویز مشرف تک کی مثالیں تو ہمارے اپنے حکمرانوں کی ہیں۔ پورے عالمِ اسلام کا حساب کریں تو ایسے خطوط کا ڈھیر لگ جائے گا۔ قرائن کہتے ہیں کہ اس بار کنڈولیزا رائس فرنینڈ وزا فر کا کردار ادا کرتے ہوئے صدر جارج بش (بادشاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا) کی طرف سے پرویز مشرف کو خط بھیج چکی ہیں کہ تمہیں سونپی گئی خدمات ہنوز

تشنۂ تکمیل ہیں۔ تمہاری تحسین کا دارومدار اسی تکمیل پر تھا جس میں رخنہ پڑ چکا ہے۔ اس بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ تم اب بھی ہماری آنکھ کا تارا ہو۔ جنرل پرویز مشرف خود کو عملیت پسند انسان کہتے ہیں۔ ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ وہ تاریخ دہرائے جانے کے اس الم انگیز لپیٹے کی زد سے خود کو محفوظ رکھیں گے لیکن اس کا کیا کریں کہ ہمارے حکمران آخر وقت میں بھی نہیں سنبھلتے۔ مثلاً: ابوعبداللہ کی مثال ہی لے لیجیے! یہ دیکھنے کے باوجود کہ عیسائی حکمران محض اپنے مفاد کی خاطر اس پر صدقے واری جاتے ہیں اور اُمیدیں پوری نہ ہونے پر تحت اللفظ دھمکیاں دیتے اور نئی ہدایات جاری کرتے ہیں، ہوش نہ آیا اور بظاہر مسلمانوں سے ہمدردی جتانے کے ساتھ درون خانہ یہی کوشش کرتا رہا کہ ان سے اپنے لیے جتنا ہو سکے ذاتی مفاد سمیٹ سکے۔ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے کہ وہ اپنے وزرا اور عوام کو بڑی دلسوزی سے یہ سمجھاتا رہا کہ یہ سب کچھ صرف اور صرف تمہارے مفاد میں کر رہا ہوں۔ مثلاً: 31 دسمبر 1491ء کو اپنے امرا اور وزرا سے آخری بار مخاطب ہو کر اس نے کہا: ''میں نے تمہیں تلوار سے بچانے کی خاطر یہ معاہدہ کیا ہے۔ تمہیں قحط سے محفوظ رکھنے کے لیے تمہاری بیویوں اور بیٹیوں کو جنگ کی انتقامی ہولناکیوں سے بچانے کے لیے، تمہارا مستقبل، تمہاری جائیدادیں، تمہاری آزادی، تمہارے قوانین اور تمہارے مذہب کی بقا کے لیے میں تمہیں بدقسمت ابوعبداللہ کی بجائے خوش بخت حاکم اعلیٰ (فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا) کی پناہ میں دیتا ہوں۔''

بظاہر ہر ''غم خوار ملت'' حکمران نے اپنی مجبوری اسی طرح پیش کی ہے مگر جب حقائق کا پردہ چاک ہوتا ہے تو کچھ مختلف قسم کے راز سامنے آتے ہیں۔ ابوعبداللہ نے جب عوام کو بچانے کی خاطر یہ اعلان کیا تو اس کی آواز شدتِ غم سے رندھی ہوئی تھی لیکن اندرون خانہ حقیقت کیا تھی؟ اب وہ دستاویز کی رو سے سامنے آ چکی ہے۔ اس نے سقوطِ غرناطہ کے

موقع پر ایک معاہدہ علانیہ کیا تھا جس میں مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت لی گئی تھی...... وہ ضمانت جو کبھی پوری نہ ہوئی اور معاہدے کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے پامال کردی گئی...... لیکن ایک اصل معاہدہ خفیہ تھا جس میں اس کم بخت نے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مفادات سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ یہ دونوں معاہدے اب میڈرڈ کے میوزیم میں محفوظ ہیں جن کے صفحے صفحے پر نفاق لکھا ہے۔ سطر سطر میں سازش تحریر ہے۔ حرف حرف میں مفادات بکھرے ہیں۔ ہوس جاہ و مال ہے۔ بے حمیتی عریاں ہے۔ ہزیمت ناقابل بیاں ہے۔ سودے بکھرے پڑے ہیں۔ مول تول لکھا ہے۔ کون کتنے میں بکا؟ سب کی قیمتیں درج ہیں۔

صدر پرویز مشرف کا کہنا تو یہ ہے کہ انہوں نے کسی کے اقتدار پر شب خون نہیں مارا لیکن ابوعبداللہ کی بدنصیبی کی داستان اپنے والد کے اقتدار پر شب خون مارنے سے شروع ہوتی ہے۔ 1482ء میں جب اس نے اپنے والد محترم مولائے ابوالحسن امیر غرناطہ کو معزول کر دیا اور بے آبرو کر کے وہاں سے انہیں چلتا کیا تو اپنے اقتدار کو حلال ثابت کرنے کے لیے وہ کاسٹائل پر چڑھ دوڑا مگر 1483ء میں لوسینا کے مقام پر ایک جھڑپ کے دوران فرڈی نینڈ کے فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ 1483ء سے 1486ء تک ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ کی قید کے دوران وہ سقوطِ غرناطہ پر ترغیبی دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اس دوران ذہنی اور اُصولی طور پر وہ سقوطِ غرناطہ پر تیار ہو چکا تھا۔ سقوط کی اس ذہنی تیاری کے معاوضے میں یہ شرط سرفہرست تھی کہ انہیں اپنے والد مولائے ابوالحسن اور چچا ابوعبداللہ الزغل کے خلاف ملکہ و بادشاہ کی غیر مشروط حمایت حاصل رہے گی۔ غرناطہ پر ان کے اقتدار کو مکمل طور پر بحال کر کے اسے دوام بخشا جائے گا۔ یہ بحالی اقتدار ہر طرح کی ''فوجی، مالی اور سیاسی امداد'' سے وابستہ تھا۔ امیر ابوعبداللہ جب اس بے حمیتی پر اُصولی اور ذہنی طور سے تیار ہو گئے تو ان سے فرمائش کی گئی کہ اس امر کو عرض نیاز کی صورت ملکہ و بادشاہ کو لکھ بھیجیں۔

ابوعبداللہ کا یہ خط جس پر انہوں نے سقوطِ غرناطہ پر آمادگی ظاہر کی ہے پورے کی بجائے پرزوں کی صورت محفوظ ہے۔ خط کے ٹکڑوں کو جوڑ لیا گیا ہے۔ جہاں تاریخ لکھی تھی وہ حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔ یوں اس خط پر سال 1486ء، مہینہ مئی تو درج ہے لیکن تاریخ نہیں ہے۔ 5 جون 1486ء کو ملکہ و بادشاہ کی طرف سے ایک اور دستاویز ابوعبداللہ کے نام لکھی گئی جس میں تین سالوں کے لیے ان تمام علاقوں، شہروں اور دیہاتوں کو تحفظ دینے کی پیش کش کی گئی جو امیر کے زیرِ اقتدار سمجھے جاتے تھے۔ اس دستاویز میں غرناطہ کے بیشتر علاقے کا دفاع اور تحفظ کی ذمہ داری عیسائی حکومت نے اپنے ذمہ لینے کی تجویز پیش کی ہے۔ یہ ساری تجاویز اس مخصوص ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں جس کی جھلک آج بھی ہمیں امریکی لب و لہجے میں واضح دکھائی دیتی ہے۔

یہاں پہنچ کر پھر شدت سے اس مقولے کی صحت وصداقت کا احساس ہوتا ہے کہ ''تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔'' میڈم کنڈولیزا رائس نے ایک حالیہ انٹرویو میں کہا ہے کہ مجھے صدر مشرف کو متحرک رکھنے کے لیے بیک وقت اسٹک اور گاجر کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ محترمہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: I have to use stick and carrot to activate Musharraf خلاصہ ومطلب یہ ہے کہ وہ صدر پرویز مشرف سے کام لینے کے لیے کبھی دباؤ (اسٹک) اور کبھی ترغیب (گاجر) کے ہتھکنڈوں سے کام لیتی ہیں۔ یا میرے پروردگار! دنیا کی ذہین اور بہادر ترین قوم کی اس قدر کھلی تذلیل! تیمور کے گھر سے غیرت تو گئی تھی اب اس پر افسوس وگریہ بھی جاتا رہا ہے۔

11 ستمبر 1491ء کو ملکہ و بادشاہ نے ''اسٹک'' اور ''گاجر'' کا استعمال کرتے ہوئے امیر عبداللہ کو ایک اور خط لکھا۔ ملکہ و بادشاہ نے لکھا:

''یہ ہمارے علم میں ہے کہ تم اور تمہارے آدمی ہماری خدمت کرتے رہے ہو۔

تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہم تم سے معاملات ختم نہیں کر سکتے نہ ہی ہمارے درمیان تعلق ختم ہوسکتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے جیسا کہ خدا کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ہمارے تحفظ سے لطف اندوز ہو گے۔ تمہیں یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ تمہارے وزیر سے معاملات طے کرتے ہوئے تمہارے مفادات ترجیحی بنیادوں پر سامنے رکھے جائیں گے لیکن عیسائی بادشاہوں کی ان ساری عنایتوں کی بنیاد اسی شرط پر استوار ہے کہ جو معاملات طے پا چکے ہیں ان پر عملدر آمد ہونا چاہیے اور ان سے انحراف صورتِ حال میں غیر یقینی بگاڑ پیدا کر دے گا۔''

یہ خط پڑھ کر اسے اپنے انجام کا یقین ہو گیا۔ اب وہ بظاہر سب کچھ مسلمانوں کی خیر خواہی اور وطن کی خدمت کے لیے کرتا رہا مگر درپردہ زیادہ سے زیادہ ذاتی مفادات کے حصول کی تگ و دو میں لگ گیا۔ اس نے اور اس کے گورنر ابوالقاسم نے بادشاہ فرڈی نینڈ کو ایک مشترکہ مگر خفیہ تجویز بھیجی۔ اس تجویز کو ''ذاتی مفادات کی مشترکہ تجویز'' کے نام سے بھیجا گیا اور اس کے محرکین میں امیر ابوعبداللہ، ابوالقاسم عبدالملک (گورنر غرناطہ) اور یوسف ابن ابوالقاسم (معتمد خاص) شامل ہیں اس مطالبہ نما تجویز میں جیسا کہ عکس پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، تحریر ہے:

''جیسا کہ یہ زیرِ غور ہے کہ ہم غرناطہ آپ کے حوالے کر دیں اور بادشاہ غرناطہ وہاں سے کچھ بھی ساتھ نہ لے جائیں یعنی ہر چیز اسی طرح چھوڑ دی جائے تو ہماری طرف سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ:

☆ سقوط غرناطہ کے موقع پر امیر ابوعبداللہ کو تین لاکھ ماراوید (اس وقت کا سکہ) ادا کیے جائیں۔

☆ ملکہ بادشاہ کے قبضے میں نوعمر یرغمالی شہزادے کو بھی اس موقع پر رہا کر دیا جائے۔

☆ وہ تمام اراضی جو سقوط غرناطہ کے سودے میں عیسائی عالی قدر بادشاہ قبول نہ کریں وہ امیر ابوعبداللہ اور ابوالقاسم عبدالملک کو دے دی جائے تا کہ ہم اسے اپنے شرائط نامے میں شامل کر کے اسے غیر فروختنی قرار دے کر اپنے ورثا کے لیے محفوظ کر سکیں۔

☆ ہماری خواتین کو زیورات، خوشبویات، ہار سنگھار، تیل روغن اور آرائشی سامان فروخت کرنے کی اجازت ہوگی۔ [انا للہ! مسلمانوں کی آٹھ سو دس سالہ عظیم سلطنت چھن رہی تھی اور کم بخت حکمرانوں کو اپنی خاتونِ اول کے میک اَپ کی فکر تھی] اگر عالی قدر بادشاہ فرڈی نینڈ کا گھرانہ ان اشیا کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہے تو وہ نسبتاً کم قیمت پر یہ اشیا خریدنے کا مجاز ہوگا۔

☆ وادی البشارہ اور اس سے ملحقہ زمینوں پر سقوط کی حد نافذ نہیں ہوگی۔

☆ معاہدہ سقوط کی یہ شرائط میرے ابوعبداللہ، ابوالقاسم عبدالملک، یوسف ابن القاسم اور ہمارے بچوں کے لیے ہیں اب تم جیسا بھی مناسب سمجھو اور اسے جس طرح بھی دیکھو لیکن بذریعہ تحریر ان کی تصدیق کر دی جائے کہ یہ شرائط جیسا کہ ہم محسوس کرتے ہیں ہماری باہمی دوستی اور تعلقات کے تناظر میں حتمی تسلیم ہوں گی کہ الحمرا پر قبضہ دیتے وقت ابوالقاسم عبدالملک کو دس ہزار سکے زرنقد اور مجھے (ابوعبداللہ) کو اضافی دس ہزار سکے زرنقد ادا کیے جائیں گے۔

☆ دالیوز کے مقام پر کیمپ میں جو مسلمان کسان مقیم ہیں وہ ہمارے لیے موسم سرما میں اناج فراہم کرتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق ابن الحاج، ابن الیاء اور ابن زید سے ہے اب وہ میری تحویل میں آچکے ہیں لہٰذا انہیں بے دخل نہیں کیا جاسکتا۔ عالی قدر بادشاہ انہیں مراعات سے سرفراز کریں۔

☆ عالی قدر عیسائی بادشاہ ہمیں یقین دہانی کرائیں، وعدہ کریں کہ ذاتی مفادات

کی یہ تجاویز جناب کی منظوری سے بہرہ مند ہوں گی۔

دستخط: امیر ابوعبداللہ

ابوالقاسم عبدالملک

یوسف ابن القاسم

ان پے درپے تجاویز، خطوط اور یادداشتوں کے جواب میں عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ کا خط امیر ابوعبداللہ کے نام موصول ہوا جس میں اس نے لکھا: ''ہمیں آپ کے تمام خطوط مل چکے ہیں ہمیں یہ توقع نہیں تھی تم اس سے زیادہ کا مطالبہ کرو گے جس پر پہلے اتفاق رائے ہو چکا ہے۔ اس سے تاخیر ہو رہی ہے۔ جو کچھ تمہیں لکھا گیا تھا تم نے اس کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اور کسی غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہو اور اس پر عملدرآمد کرنے سے قاصر رہے ہو۔ تم نے مزید مہلت کا تقاضا کیا ہے اس سے زیادہ وقت مانگتے ہو جس پر ہم متفق ہو چکے تھے۔ تمہیں ہر اس شرط پر عملدرآمد کرنا ہوگا جس پر باہمی اتفاق ہو چکا ہے اور جس کی حتمی تصدیق تمہیں ارسال کی جا چکی ہے۔ اگر تم ان شرائط پر عملدرآمد نہیں کرو گے جو طے پا چکی ہیں اور جو ہم تحریری طور پر باضابطہ لکھ کر منظور کر چکے ہیں تو ہم پر بھی ان شرائط کو ماننے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جو ہم نے قبول کی تھیں۔ تحریری طور پر یہ موجود ہے کہ غرناطہ کی حوالگی ایک معینہ مدت میں ہونا تھی اب جبکہ غرناطہ سے تمہاری دست برداری میں تاخیر ہو چکی ہے تو ایسے میں متعلقہ شرائط ساقط ہو چکی ہیں خواہ وہ تحریری ہی تھیں۔''

عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ

کھیل بگڑتے مضمون کے اس خط نے امیر ابوعبداللہ اور اس کے حواریوں کو سخت دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ صلیبی سیاست کا شکار ہونے پر روئے یا مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کا سلسلہ جاری رکھے۔ کاش! وہ سنبھل جاتا۔ اس کے پاس

35ہزار سپاہی موجود تھے جیسا کہ ہمارے پاس دنیا کی بہترین فوج اور ایٹم بم موجود ہے۔

اندلس کے مسلمانوں پر عجب وقت پڑا تھا۔ ادھر قیامت اپنی چال چل رہی تھی۔ ادھر مسلمان حکمران اندر خانے عیسائی حکمرانوں سے اپنے لیے جس قدر بٹور سکتے تھے اس کے حصول میں سرگرداں تھے۔ ڈوبتے جہاز سے وہ جو کچھ بچا سکتے تھے جہاز بچانے سے زیادہ انہیں اس کی فکر تھی۔ ادھر ملکہ ازابیلا و بادشاہ فرڈی نینڈ، ہر گزرتے دن کے ساتھ مسلمانوں کی کمزور ہوتی مدافعت کے ساتھ ساتھ شرائط سقوط کو سخت سے سخت تر بناتے جاتے تھے۔ 1491ء کے شروع ہوتے ہی امیر ابوعبداللہ یقینی طور پر نوشتہ دیوار پڑھ چکے تھے۔ اب ان کی ساری جدوجہد اس نکتے پر مرکوز ہو چکی تھی کہ غرناطہ کے بدلے انہیں ذاتی طور پر کیا مل سکتا ہے؟ وہ خفیہ طور پر عیسائی حکمرانوں سے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ پر محو مذاکرات تھے اور ان کی معاونت گورنر غرناطہ ابوالقاسم عبدالمالک، یوسف ابن ابوالقاسم اور حمد النفیس وغیرہ کررہے تھے۔ جبکہ یہ معاونین اپنے اپنے طور پر بھی عیسائی دربار سے ذاتی مفادات کے لیے مذاکرات میں مصروف تھے [غرناطہ بیک وقت سورۃ التکویر کی تفسیر اور وہاں کے مسلمان حکمران سورۃ البقرۃ کی شہادت بنے ہوئے تھے] اندلس کی زمین پر سجدے اور فضا میں اذانوں کی صدا تمام ہو رہی تھی۔ وہاں سورج لپیٹ رہا تھا اور ستارے بکھر رہے تھے، حاملہ عورتیں بچہ جننے کے لیے محفوظ مقام ڈھونڈتی تھیں۔ دریا خون اور آگ سے بھرے تھے۔ جہنم بھڑک رہا تھا۔ سب وحشی جانور یکجا ہو چکے تھے۔ قہر زدہ غرناطہ میں یہ مسلمانوں کے آخری ایام تھے۔

دوسری طرف مسلم حکمران تھے جو غرناطہ کے بدلے میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کا مستقبل سنوارنے میں لگے تھے۔ وہ اپنی بے حمیتی، سازشی ذہنیت، طمع اور ہوس جاہ کے ہاتھوں مسلمانوں کے آٹھ سو دس سالہ اقتدار کے سورج کو پہر دو پہر اور پل دو پل کی ڈوبتی

شام تک لے آئے تھے، جیسے وہ سب ڈوبنے سے پہلے آخری ہچکی کے انتظار میں ہوں۔ آخری محل، آخری گھر، کچھ اراضی، کچھ نقد، کچھ جنس، کوئی مال مویشی، کوئی راہداری، کوئی مقام مرتبہ، کچھ نام نمود، کچھ مال متاع یوں جیسے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہوں۔ وہ اپنے پتے، پینترے چالیں چل گزرے اور سارے چکمے دے بیٹھے مگر ایک چال بہترین چال چلنے والے کی بھی ہوتی ہے:

''ادھر تو وہ چال چل رہے تھے اور ادھر خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔'' (سورۃ الانفال)

ہمیں چال چلنے والوں اور چکمہ دینے والوں، دونوں سے پناہ دے۔ اِدھر وانا، باجوڑ، وزیرستان، میران شاہ...... افغانستان اور عراق میں بھی سورج لپٹ رہا ہے اور ستارے بکھر رہے ہیں۔ عورتیں تو عورتیں، گابھن اونٹنیاں بھی بے سمت، بے مہار بھاگتی پھرتی ہیں اس ڈر سے کہ جانے وہ کس کا نام لے دیں زندہ درگور بچیوں سے کوئی یہ پوچھنے والا نہیں ہے کہ وہ کس خطا پر ماری گئیں؟ اور نامہ اعمال کھلنے کو ہے۔ ادھر عیسائی حکمران بھی وہی آزمودہ وآل از ابیلا ہیں۔ اولا دفرڈی ننیڈ اور زافراو کافرا ہیں۔ دلوں میں دھڑکا لگا ہے کہ یا اللہ! ایسے میں ہمارے حاکم بھی حاکمان اندلس جیسے نہ نکل آئیں۔ اندر خانے عیسائیوں سے ملے ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف چالیں چلنے والے اور باریش مسلمانوں کو چکمے دینے والے، کلمہ گو بیبیوں کو نامحرم مردوں سے اختلاط پر اُبھارنے والے، ان کی نیم ستر پوشی پر تالیاں بجانے والے، انہیں برہنگی پر آمادہ کرنے والے، ہماری مخبری کرنے والے، گھیر گھیر کر پکڑنے والے، اہلِ حق کے گھروں پر نشان لگانے والے، ذاتی مفادات کے معاہدے کرنے والے، ہمیں نیچا دکھانے والے، شعائر کے سودے اور ملک کی اساس پر مذاکرات کرنے والے، اُمہ کی دینی حمیت پر مول تول کرنے والے۔

وان ڈی ماریانا سقوطِ غرناطہ کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''2 جنوری کو سقوط کی صبح ابھی نمودار بھی نہیں ہوئی تھی کہ امیر ابوعبداللہ کی گھریلو خواتین منہ اندھیرے قصر الحمرا سے البشارہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ خواتین کی اس جماعت میں امیر کی والدہ سلطان عائشہ لہورہ اور بیوی زہرہ زورامہ کے علاوہ شاہی خاندان اور قریبی امرا کی خواتین شامل تھیں۔ سلطانہ عائشہ لہورہ نے تو ہمت کا ثبوت دیا اور خاموش رہیں لیکن باقی خواتین الحمرا کو مڑ مڑ کر دیکھتی تھیں اور روئے جاتی تھیں۔ ان کی آہ و بکا اور سسکیوں سے البشارہ کی سنسان وادی گونجتی تھی۔ ادھر غم اور صدمے سے نڈھال امیر عبداللہ کو شہر غرناطہ کی چابیاں ملکہ ازابیلا اور فرڈی نینڈ کو پیش کرنے کا المناک مرحلہ درپیش تھا۔ وہ شدت غم سے مغلوب رندھی ہوئی آواز میں چابیاں دیتے وقت فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا سے صرف یہی کہہ سکا: ''یہ چابیاں اسپین میں مسلمان سلطنت کی آخری نشانی ہیں۔ یہ ہماری مملکت اور ہمارے ہونے کی علامت ہیں۔ خدا کی منشا یہی ہے کہ یہ تمھیں دے دی جائیں۔ یہ تمھیں اس اُمید پر سونپتا ہوں کہ تم ہم سے نرمی کا سلوک کرنے کے وعدے پر قائم رہو گے۔'' اس کے جواب میں بادشاہ فرڈی نینڈ نے مختصر سے جواب میں کہا: ''شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر نہ ہی دوستی کے اس ثمر پر جس سے جنگ کی وجہ سے ہم محروم رہے ہیں۔''

تاریخ گواہ ہے کہ اس وعدے پر ایک دن کے لیے بھی عمل نہ ہوا۔ معاہدہ کر کے پھر جانے کی جو روایت ہسپانیہ کے حکمرانوں نے ڈالی تھی، کولمبس نے امریکا پہنچ کر اس کو آگے بڑھایا۔ وہ ریڈ انڈینز سے وعدے کرتا اور پھر موقع ملتے ہی انہیں قتل کر ڈالتا۔ کولمبس کا یہ تجربہ اور رویہ اس زمین میں خوب پھلا پھولا۔ یہ کارِ بد یہاں یوں نسل در نسل پروان چڑھا اور یہ غیر انسانی عادت ملکہ ازابیلا سے کولمبس میں، کولمبس سے برطانوی آبادکاروں میں اور برطانوی آبادکاروں سے امریکی حکومتوں میں منتقل ہوتی رہی۔ منتقلی کا یہ عمل اب مکمل ہو کر

صیقل ہو چکا ہے۔ وعدہ شکنی اب امریکا کے مزاج کا حصہ اور فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ 1502ء میں جس طرح عبیدہ سلیمانکا، المیرہ، غرناطہ اور قرطبہ میں شرعی ریش کے حامل مسلمان ترجیحی ہدف تھے بعینہٖ باریش آج بھی اس طرح قتل کیے جا رہے ہیں اور حیران کن یکسانیت یہ ہے کہ بال کٹی، آنکھ لگی، ڈورے پڑی، غازہ ملی، سینہ کھلی، گھر سے اکھڑی، میراتھن میں دوڑنے والی، غیر مردوں سے مصافحہ اور نامحرموں سے ہنس کر ملنے والی، ناچ گانے کی محفلوں میں بانہیں پھیلانے والی، جالی دار شوخ رنگ کپڑے پہننے اور گنجی ٹنڈوں کے ساتھ رل کر فضا میں شوقِ پرواز کو تسکین دینے والی روشن خیال، چترزبان اور شعلہ بیان اس اجل سے عموماً محفوظ رہی ہے۔

مومنوں کے بارے میں نوید ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسے جاتے لیکن ہم پر یا تو یہ نوید زیادہ کڑی ہے یا ہماری آزمائش زیادہ سخت ہے۔ واقعہ جو بھی ہو لیکن ہم بار بار ایک ہی سوراخ سے ڈسے گئے ہیں۔ ☆ سقوطِ غرناطہ ☆ سقوطِ دہلی (مسلم ہندوستان) ☆ سقوطِ بیت المقدس ☆ سقوطِ مشرقی پاکستان ☆ سقوطِ کابل ☆ سقوطِ بغداد ☆ سقوط......؟

اللہ ہمیں سقوط کا ایک اور شاک لگنے سے محفوظ رکھے...... لیکن آثار و قرائن اپنی پوری خوفناکی کے ساتھ کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ ملکہ ازابیلا، بادشاہ فرڈی نینڈ، کرسٹوفر کولمبس، ملکہ الزبتھ، سر تھامس رو، رابرٹ کلائیو، کنڈولیزا رائس، ٹونی بلیئر اور جارج ڈبلیو بش...... ایک تسلسل ہے جو ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ ایک عفریت ہے جس نے مسلم اُمہ کی گردن دبوچی ہوئی ہے۔ ایک ہی خون آشام ہے جس کے دانت پانچ صدیوں سے ہماری شہ رگ میں گڑے ہوئے ہیں۔ مسلمانو! ہسپانیہ سے نکل جاؤ سے نیو ورلڈ آرڈر تک اور نیو ورلڈ آرڈر سے حملہ برائے حفظ ماتقدم تک ایک ہی نظریہ ہے جو نام بدل بدل کے اُمت کا لہو چاٹ رہا

ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ادھر شقاوت اور مطالبے بڑھتے جا رہے ہیں اور اُدھر خود سپردگی۔ ادھر طرز جابرانہ عروج پر ہے اور ادھر ادائے فدویانہ۔ ہمارے جرمِ ضعیفی نے جہاں بہت سے اور نقصان ہمیں پہنچائے وہاں اس سے یہ بھی ہوا کہ ہمارے محاورے تک بدل گئے ہیں۔ بھلے وقتوں میں ''آزمائے ہوئے کو آزمانا حماقت ہے'' خاصا معتبر محاورہ سمجھا جاتا تھا اور آزمائے ہوئے کو مزید آزمانے سے پرہیز کیا جاتا تھا لیکن اب صورتِ حال کچھ یوں ہوگئی ہے کہ ہم آزمائے ہوئے کو مزید آزماتے رہنے پر بھی کمر بستہ ہو چکے ہیں۔ بادشاہ فرڈی نینڈ کی طرح صدر جارج بش بھی ہم سے یہی کہے جا رہے ہیں: ''شک نہ کرو ہمارے وعدوں پر'' گو کہ اندر سے ہم سب جانتے ہیں کہ صدر بش کے وعدے پر شک نہ کرنے کے باوجود بھی ہونا وہی ہے جو بادشاہ فرڈی نینڈ کے وعدے پر شک نہ کرنے سے ہوا تھا۔

یا اللہ! ہم پر رحم کر، ہم پر اپنی پناہ دراز کر دے۔

ہمیں یقین ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے حکمران ایسے نہیں ہوں گے مگر اس کا کیا کیجیے کہ اہلِ غرناطہ بھی اسی گمان میں مارے گئے کہ ان کے حاکم ایسے نہیں ہوں گے۔

ہمارے قتل نامے پر آج پھر وہی مُہر ثبت ہے جو پانچ صدیاں پہلے بھی ثبت کی جا چکی ہے۔ سقوطِ اندلس کے اجزائے ترکیبی میں مسلم حکمرانوں کی خود غرضی، عیسائی انتہا پسندی اور صہیونی سازش شامل تھی...... امریکا کے اجزائے ترکیبی میں مسلمانوں کی ہزیمت، عیسائی انتہا پسندی اور صہیونی سازش شامل ہے۔ پانچ صدیاں بھی ان اساسی عناصر میں تبدیلی نہیں لا سکیں...... ہم نے تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور ملک کو وہاں لا کھڑا کیا ہے کہ خدا ہی رحم کرے تو کرے ورنہ...... خطرہ ہے کہ ہم پر کلمۂ حق پورا نہ ہو جائے جیسا کہ ہسپانیہ کا بے ضمیر حکمرانوں کا ہوا تھا۔

مماثلت.....جبری یا فطری؟

خبر گرم ہے کہ عزت مآب جلالۃ القدر سپہ سالارِ اعلیٰ افواجِ پاکستان و رئیس مملکتِ خداداد جناب پرویز مشرف ہسپانیہ تشریف لے گئے ہیں اور قرطبہ مسجد کا دورہ کیا ہے۔ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ یہ پہلے پاکستانی حکمران ہیں جنہیں یہ اعزاز نصیب ہوا ہے اور دوسری طرف کسی ستم ظریف نے کارٹون بنا کر پھبتی کسی ہے کہ صدر پرویز نے اپنے میزبانوں سے دریافت کیا ہے: ''کیا آپ لوگ سیکیورٹی پرابلم کی وجہ سے پرانی مسجدیں نہیں گراتے؟''

مولائے کریم کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔ صدر پرویز مشرف کا دورہ ماہ مئی کی آمد آمد پر ہوا ہے اور مئی وہی مہینہ ہے جو تاریخ اُندلس کے حوالے سے ایک طرف انتہائی تابناک اور دوسری طرف انتہائی المناک پس منظر رکھتا ہے۔ ہم نے درج بالا دو تبصروں کی رو سے دیکھنا ہے کہ جنابِ صدر تاریخ کے کس رُخ سے مماثلت و مشابہت رکھتے ہیں؟ خدارا! جبراً کوئی مناسبت نہ تلاش کی جائے۔ ہر چیز کو اس کی فطری ساخت پر کسی تکلّف کے بغیر پرکھا جائے۔

☆......☆......☆

مئی کا مہینہ مسلمانوں پر دوطرح سے گزرا ہے۔ ایک تو تابناک، درخشاں تر اور رخشندہ ترین اور دوسرے المناک، سیاہ ترین اور خون سے رنگین۔

☆ یکم مئی 70ء کو ہسپانیہ کے ساحل پر (موجودہ مقام جبرالٹر) ایک طول القامت، چھریرے بدن، گھنی ڈاڑھی اور ایمانی جذبات سے تمتماتے چہرے والا سنجیدہ اور باوقار شخص اپنی مٹھی بھر سپاہ سے مخاطب تھا۔ مشہور ادیب ابوالعباس احمد بن محمد المغری نے طارق بن زیاد کے اصل الفاظ قلم بند کیے ہیں:

''لوگو! تمہارے لیے بھاگنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟ تمہارے پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن! لہٰذا خدا کی قسم! تمہارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ تم اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد میں سچے اُترو اور صبر سے کام لو۔ یاد رکھو! اس جزیرے میں تم ان یتیموں سے زیادہ بے آسرا ہو جو کسی کنجوس کے دستر خوان پر بیٹھے ہوں۔ دشمن تمہارے مقابلے کے لیے اپنا پورا لشکر اور اسلحہ لے کر آیا ہے۔ اس کے پاس وافر مقدار میں غذائی سامان بھی ہے اور تمہارے لیے تمہاری تلواروں کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں۔ تمہارے پاس کوئی غذائی سامان اس کے سوا نہیں جو تم اپنے دشمن سے چھین کر حاصل کر سکو۔ اگر زیادہ وقت اس حالت میں گزر گیا کہ تم فقر و فاقہ کی حالت میں رہے اور کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ابھی تک تمہارا جو رعب دلوں پر چھایا ہوا ہے اس کے بدلے دشمن کے دل میں تمہارے خلاف جرات و جسارت پیدا ہو جائے گی۔ لہٰذا اس برے انجام کو اپنے آپ سے دور کرنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ تم پوری ثابت قدمی سے اس سرکش بادشاہ کا مقابلہ کرو جسے اس کے محفوظ شہر نے تمہارے سامنے لا کر ڈال دیا ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو موت کے لیے تیار کر لو تو اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھانا ممکن ہے اور میں نے تمہیں کسی ایسے انجام سے نہیں ڈرایا جس میں خود بچا ہوا ہوں، نہ میں تمہیں کسی ایسے کام پر آمادہ

کررہا ہوں جس میں سب سے سستی پونجی انسان کی جان ہوتی ہے اور جس کا آغاز میں خود اپنے آپ سے نہ کررہا ہوں۔ یادرکھو! اگر آج کی مشقت پر تم نے صبر کیا تو طویل مدت تک لذت وراحت سے لطف اندوز ہو گے......

اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارا یہ عمل دنیا وآخرت دونوں میں تمہاری یادگار رہنے گا۔ اور یادرکھو کہ جس بات کی دعوت میں تمہیں دے رہا ہوں اس پر پہلا لبیک کہنے والا میں خود ہوں۔ جب دونوں لشکر ٹکرائیں گے تو میرا عزم یہ ہے کہ میرا حملہ اس قوم کے سرکش ترین فرد راڈرک پر ہوگا اور ان شاء اللہ میں اپنے ہاتھ سے اسے قتل کروں گا۔ تم میرے ساتھ حملہ کرو! اگر میں راڈرک کی ہلاکت کے بعد شہید ہوا تو راڈرک کے فرض سے تمہیں سبکدوش کر چکا ہوں گا اور تم میں ایسے بہادر اور ذی عقل افراد کی کمی نہیں جن کو تم اپنی سربراہی سونپ سکو اور اگر میں راڈرک تک پہنچنے سے پہلے ہی کام آ گیا تو میرے اس عزم کی تکمیل میں میری نیابت کرنا تمہارا فرض ہوگا۔ تم سب مل کر اس پر حملہ جاری رکھنا اور پورے جزیرے کی فتح کا غم کھانے کی بجائے اس ایک شخص کے قتل کی ذمہ داری قبول کر لینا تمہارے لیے کافی ہوگا کیونکہ دشمن اس کے بعد ہمت ہار بیٹھے گا۔''

طارق کے رفقا پہلے ہی جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے سرشار تھے۔ طارق کے اس خطبے نے ان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی، وہ وادیٔ لکہ کے معرکے میں اپنے جسم وجان کو فراموش کر کے لڑے۔ یہ جنگ متواتر آٹھ دن تک جاری رہی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور بالآخر فتح ونصرت مسلمانوں کے حصے میں آئی۔ راڈرک کا لشکر بری طرح پسپا ہوا اور خود راڈرک بھی اسی تاریخی معرکے میں کام آیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے خود طارق بن زیادہ نے قتل کیا اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا خالی گھوڑا دریا کے کنارے پایا گیا جس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہوا۔

وادیٔ لکہ کی یہ فتح جو ایک ہفتے کی صبر آزما جنگ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئی، یورپ میں مسلمانوں کے داخلے کی تمہید تھی جس نے پورے اندلس کے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ اس کے بعد مسلمان اندلس کے تمام شہر فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے اس وقت کے دارالحکومت طلیطلہ کو بھی فتح کر لیا۔ اس کے بعد بھی ان کی پیش قدمی جاری رہی یہاں تک کہ وہ فرانس کے اندر جا کر وہ کوہ نیری نیز کے دامن تک پہنچ گئے۔ اندلس کی فتح کے بعد مسلمانوں نے یہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی جس کے دوران انہوں نے علم و دانش اور تہذیب و تمدن کے منفرد چراغ روشن کیے اور اس خطے کو دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ بنایا۔

☆......☆......☆

☆ دوسرا مہینہ بھی مئی ہی کا ہے۔ سال 1486ء، دن نامعلوم...... یہ اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔ اندلس کے آخری مسلمان حکمران ابو عبداللہ نے ملکہ اور بادشاہ فرڈی نینڈ کو لکھا کہ وہ کیتھولک ملکہ و بادشاہ کو غرناطہ سونپ دینے پر تیار ہو چکے ہیں لیکن کیوں اور کیسے؟ اس کے لیے ہم مندرجہ ذیل چار خطوط پر نظر ڈالیں گے شاید آئینے میں اپنی تصویر بھی نظر آ جائے۔

(1) 29 اپریل 1487ء کو امیر عبداللہ نے ملکہ ازابیلا کو ایک خط بھیجا جس میں ملکہ سے درخواست کی گئی کہ کسی بھی شورش، خرابی اور بیرونی حملے کی صورت میں ''غرناطہ کے دفاع'' میں کوتاہی نہ کی جائے۔ ہم آپ سے توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی بھی مشکل صورتِ حال میں آپ کی حکومت ہمیں غرناطہ میں غیر محفوظ نہیں چھوڑے گی اور ہم غرناطہ میں اپنے دفاع کے لیے آپ کی طرف دیکھتے ہیں۔''

سبحان اللہ! کیا عالم تھا فہم و فراست کا! جن سے حقیقی خطرہ تھا انہی سے تحفظ کی بھیک

مانگی جارہی تھی۔

(2) ملکہ و بادشاہ کی طرف سے امیر عبداللہ کے گورنر ابوالقاسم کو لکھا گیا: ''مجھے میرے سیکرٹری فرڈی نینڈ زافرا نے بتایا ہے کہ تم ہماری خدمت کرنا چاہتے ہو اور ہماری سرپرستی میں پناہ چاہتے ہو۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ تم ہمارے دربار میں حاضری دے کر شائستگی کا مظاہرہ کر چکے ہو۔ ہمارے اور زافر کی طرف سے تمہیں پورے اختیارات ہیں جنہیں تم استعمال کرتے ہو۔ ہم تم پر مہربان رہیں گے اور عنایات کا تسلسل ٹوٹنے نہیں دیں گے۔ لیکن یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ تم کسی اور کے ساتھ معاملات طے کرنے سے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ میں حکم دیتا ہوں کہ تم زافر سے ہدایات لیتے رہو اور احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کے مرتکب نہ ہونا۔''

خدارا! ذرا سطور کے ساتھ بین السطور بھی پڑھ لیجیے!

(3) 11 ستمبر 1491ء کو ملکہ و بادشاہ نے امیر ابوعبداللہ کو تشفی کراتے ہوئے ایک اور خط لکھا۔ ملکہ و بادشاہ نے لکھا: ''یہ ہمارے علم میں ہے کہ تم اور تمہارے آدمی ہماری ''خدمت'' کرتے رہے ہو۔ تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ ہم تم سے معاملات ختم نہیں کر سکتے نہ ہی ہمارے درمیان تعلق ختم ہو سکتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے جیسا کہ خدا کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ہمارے تحفظ سے لطف اندوز ہو گے۔ تمہیں یہ بات پہلے بھی بتائی جا چکی ہے کہ تمہارے وزیر سے معاملات طے کرتے ہوئے تمہارے مفادات ترجیحی بنیادوں پر سامنے رکھے جائیں گے لیکن عیسائی بادشاہوں کی ان ساری عنایتوں کی بنیاد اسی شرط پر استوار ہے کہ جو معاملات طے پا چکے ہیں ان پر عملدرآمد ہونا چاہیے اور ان سے انحراف صورتِ حال میں غیر یقینی بگاڑ پیدا کر دے گا۔''

دبے لفظوں میں دھمکی قابل داد ہے۔

(4) جیسا حکمران ہوتا ہے ویسے ہی اس کے دست و بازو۔ امیر ابوعبداللہ کے گورنر بھی اس سے کم نہ تھے۔ 16 ستمبر 1491ء کو گورنر ابوالقاسم عبدالملک اور اس کے دستِ راست یوسف ابن قاسم نے مشترکہ طور پر ایک خط بادشاہ فرڈی نینڈ کو عربی میں لکھا اور کاسٹیلین اسپینش میں اس کے ترجمے کے ساتھ دستخط شدہ کاپی بھی منسلک کر دی۔ عربی میں خط کا آخری حصہ ہی محفوظ رہ سکا جبکہ اسپینش میں پورا خط موجود ہے۔ اس خط کا محفوظ نہ رہنا ہی بہتر تھا کہ محفوظ رہتا تو اندلس کے امرا کی بے حمیتی پر نا قابلِ تردید گواہی موجود رہتی اور اگر محفوظ رہ جاتا تو شاید نصاب عبرت کا صفحۂ اول قرار دیا جاتا۔ ابن قاسم اور یوسف نے بادشاہ فرڈی نینڈ کو لکھا: ''اے ذی شان بادشاہ! ہم تمہارے حضور پیش ہو کر تمہارے ہاتھ چومنا چاہتے ہیں اور تمہارے جسم کا ہر وہ حصہ جس کی اجازت دی جائے گی چومنا چاہتے ہیں تاکہ ان غلاموں کی وارفتگی تم خود دیکھ سکو جو وہ تم سے وابستہ کیے ہیں۔ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ تمہارے مفادات سے صرفِ نظر نہیں کریں گے۔ زافر (عیسائی بادشاہ کا مشیرِ خاص جو بیچ کے آدمی کا کام دیتا تھا) ہمارا بھائی ہے ہم اس سے احکام کے ملنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ جونہی بادشاہ یسوع مسیح کی طرف سے ہدایات ہمیں بھیجتا ہے پھر ان پر عمل پیرا ہونے میں کسی تاخیر اور کوتاہی کا کوئی حوالہ زافر کے پاس نہیں ہے، جو آپ کو بتا سکے۔ ہم اپنی وفاداری پر قائم اور آپ کے مفادات کے محافظ ہیں۔ یقیناً زافر اس کی گواہی دینے میں فخر محسوس کرے گا۔''

اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرنے کی بجائے دشمن سے رحم کی اُمید رنگ لائی اور بالآخر وہ دن آ پہنچا جب عیسائیوں کو اپنا محافظ اور مسلمانوں کو دشمن سمجھنے والے غرناطہ کے حکمران ابوعبداللہ قصر الحمرا میں اپنے امرا و حکام کے ساتھ سقوط کے معاہدے کے مطابق غرناطہ کی چابیاں ملکہ ازابیلا کو پیش کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ابوعبداللہ، شاہی خاندان کے

افراد اور امرا زرق برق لباس زیب تن کیے تھے۔ ان کے زرہ بکتر سونے چاندی کی کڑیوں سے چمک رہے تھے اور ان میں جواہرات ٹنکے تھے۔ قصر الحمرا میں ملکہ ازابیلا، بادشاہ فرڈی نینڈ، عیسائی افواج کے جرنیلوں، امرا اور حکام کے استقبال کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ آج الحمرا کی شان ہی نرالی تھی۔ محل میں جگہ بہ جگہ مَر مَر کے فرش لشکارے مارتے تھے کہیں دیبا کے گاؤ تکیے سجے تھے اور کہیں حریر و پرنیاں کے پردوں پر پکھراج کے تازہ بتازہ حاشیے تھے۔ موتیوں کی لڑیاں آرائش کو بڑھاتی تھیں۔ چاندی کے چمکتے عصا، سونے کے مورچھل، سونے چاندی کا چتر اور حریر کے پتے ماحول کو طلسماتی بنائے ہوئے تھے۔ سونے کے ساربان، زرنگار تخت، جواہرات سے مرصع تخت پوش اور سیاہ بخت تخت نشین۔ دیکھنے میں تو الحمرا اپنی آرائش، امارت اور قدر و قیمت میں بے مثال نظر آتا تھا مگر اندلس میں مسلم اقتدار کی یہ آخری شام، آخری ہچکی اور آخری بدعملی تھی۔ سے پر اختیار جاتا رہے تو ساتھ ہی فیصلہ کرنے کا شرف، فیصلے کی تکریم اور قوت فیصلہ بھی جاتی رہتی ہے۔ سو امیر ابوعبداللہ (باب دل) کا یہ آخری فیصلہ بھی مسترد کر دیا گیا کہ غرناطہ کی کلید سقوط کی علامت کے طور پر الحمرا میں پیش کی جائے گی۔ ملکہ ازابیلا نے امیر ابوعبداللہ کی خواہش کے برعکس الحمرا سے باہر فاصلے پر سقوط کے ڈراپ سین کا حکم جاری کیا۔ ملکہ ازابیلا اپنے شوہر بادشاہ فرڈی نینڈ، بیٹے پرنس ڈان، لاؤلشکر، فاتح افواج، امرا، مشیروں، رعونت، حکام اور درباریوں کے جلو میں غرناطہ کی چابیاں وصول کرنے پہنچی تو اس کے ہمراہ اس کا مذہبی مشیر اعظم کارڈینیل ہرعینڈ وٹالا ویرا اور اس کا اطالوی بحری مہم جو مہمان کرسٹوفر کولمبس بھی موجود تھا جسے سقوط غرناطہ کی تقریب میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ کولمبس نے اس رات اپنے روزنامچے میں لکھا:

''آج میں نے دیکھا کہ الحمرا کے میناروں پر ملکہ عالیہ (ازابیلا) کا شاہی نشان بزور قوت لہرا دیا گیا اور پھر مسلمان (مور) بادشاہ ابوعبداللہ کو شہر کی فصیل کے دروازے پر ملکہ ازابیلا

اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے ہاتھ چومتے ہوئے دیکھا۔''

امیر ابوعبداللہ کو عیسائی حکمرانوں کے وعدوں پر بہت زیادہ اعتماد تھا۔ ہم سے بھی زیادہ مگر...... ابھی معاہدہ غرناطہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور فرڈی نینڈ کا کہا فضا میں گونجتا تھا کہ معاہدہ غرناطہ پرزے پرزے ہوگیا۔ مسلمانوں پر ہسپانیہ کی زمین ایسی تنگ ہوئی کہ بالآخر وہاں سے ان کے جبری انخلا کا حکم نامہ جاری ہوا۔ کہاں وہ معاہدۂ غرناطہ کی تحفظاتی دفعات اور کہاں یہ 1609ء کا حکم نامہ بے دخلی۔ معاہدے میں جو خوش آیند شرائط موجود تھیں وہ دیکھتے ہی دیکھتے طاق نسیاں ہوگئیں۔ مسلمانوں پر ترکِ اسلام اور قبول عیسائیت کے لیے ہر طرح کا جبر اور دباؤ روا رکھا گیا۔ دس سال تو اس دباؤ اور جبر کا نتیجہ دیکھنے میں گزر گئے لیکن اب مسلمانوں کی استقامت ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ ادھر عیسائی بنیاد پرستوں کا حلقہ ملکہ ازابیلا کے گرد تنگ ہوتا جارہا تھا جس کی قیادت ٹولیڈو کو اسقف اعظم اور ادارہ احتساب کا نگران اعلیٰ کارڈینیل ذمی نیس کررہا تھا۔ ذمی نیس کو ملکہ کا قرب حاصل تھا اس نے ''مسلمانوں کے انخلا یا بالجبر قبول عیسائیت'' کے نظریے کو متعارف کرایا اور رفتہ رفتہ ملکہ ازابیلا کو اس پر آمادہ کرلیا۔ بالآخر ملکہ ازابیلا کے دستخطوں سے 12 فروری 1502ء کو ایک حکم نامہ جاری ہوا جس کے مطابق ہسپانیہ کے مسلمانوں کو عیسائیت کا بپتسما لینے یا ہسپانیہ سے چلے جانے میں سے ایک کے لازمی انتخاب سے دوچار کردیا گیا۔ یہ نئی افتاد پرانے تمام مظالم سے سخت تھی۔ وہی ملکہ ازابیلا جس کے سقوط غرناطہ کی ان شرائط پر دستخط ثبت ہیں جن کے تحت مسلمانوں کے جان و مال، آبرو، مذہب، قوانین، رسوم، زبان اور ثقافت کے تحفظ کی ضمانت موجود تھی۔ صرف دس برس بعد اسی ملکہ ازابیلا کے اس نئے حکم نامے سے معاہدہ سقوط غرناطہ کی نفی ہوگئی۔

ملکہ ازابیلا کے بالجبر تبدیلی مذہب کے احکام پر سو سال سے اوپر گزر گئے لیکن نہ تو

مسلمانوں کی استقامت میں کوئی خاص فرق آیا نہ پاؤں میں لغزش۔ اگر جان بچانے کو کسی نے عیسائیت قبول کر بھی لی تو اندر سے وہ مسلمان ہی رہا۔ ان سو سالوں میں اندلس کے مسلمانوں پر ہر وہ ظلم آزمایا گیا جسے غیر انسانی جلبت نے تاریخ کے کسی بھی تاریک دور میں ایزاد کیا تھا۔ مسلمانوں پر ظلم وستم کی پوری صدی گزر گئی لیکن عیسائیت قبول کرنے والوں کے اعداد وشمار نہ بڑھ کے دیے۔ بالآخر عیسائی ترکش میں آخری تیر کو آزمانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ آخری تیر 1609ء میں ہسپانیہ سے مسلمانوں کے جبری انخلا کے حکمنامے کے ساتھ پھینکا گیا۔

1607ء میں اسپین کی حکومت دیوالیہ ہوگئی۔ اس مالی دیوالیے نے اسپین کے بادشاہ فلپ سوئم کی ساکھ اور اسپین کی شاہی حکومت کے اعتبار کو یورپ میں سوالیہ بنادیا۔ مسلمانوں کے جبری انخلا کے قانون سے فلپ سوئم نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو وہ اہلِ اسپین اور یورپ کی توجہ اپنی حکومت کی ناکامیوں سے ہٹانے میں کامیاب رہا۔ دوسرا مسلمانوں کے جبری انخلا سے ان کی چھوڑی ہوئی وسیع اراضی عیسائیوں کے ہاتھ آگئی اس سے نہ صرف معیشت کو سہارا ملا بلکہ فلپ سوئم عیسائیت کے نجات دہندہ کے طور پر اسپین اور یورپ میں ہر دلعزیز ہوگیا۔ خصوصاً کیتھولک عیسائیت کے مرکز ویٹی کن سٹی روم میں اس کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ 9 اپریل 1609ء کو بادشاہ فلپ سوئم (1598-1621) نے ہسپانیہ سے مسلمانوں کے جبری انخلا کا درج ذیل حکم نامہ جاری کیا:

''بادشاہ فلپ سوئم کی طرف...... اہل غرناطہ خطاب یافتہ عیسائی معتوزین، امرا، اراکین، اشرافیہ، مذہبی علماء معزز شہریوں کے نام!

☆ اس مملکت سے تمام مسلمان مرد وزن، اپنی آل اولاد کے ساتھ اس حکم نامے کے جاری ہونے کے تین دن کے اندر اندر بلا امتیاز کہ وہ جہاں بھی رہتے ہوں حکام کے

بتائے ہوئے مقامات پر چلے جائیں۔ وہ اپنے ساتھ ایسی منقولہ جائیداد لے جاسکتے ہیں جسے وہ اُٹھا سکتے ہوں۔ جہاز، جوان کو بَر بَر مملکت میں لے جانے کے لیے تیار ہیں انہیں بغیر کسی بدسلوکی یا غیر مناسب رویے کے افریقہ تک لے جائیں گے۔

☆ دوران سفر ''مناسب سہولتیں'' فراہم کی جائیں گی اور وہ حسب خواہش اپنا مال اسباب لے جاسکیں گے لیکن اس دوران کسی بھی مرحلے پر اس حکم نامے کی خلاف ورزی پر موت کی سزا دی جائے گی جس پر فوراً عملدرآمد ہوگا۔

☆ مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بادشاہ فلپ سوئم کا مقصد مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکالنا ہے نہ کہ نہیں ہراساں کرنا یا دوران سفر صعوبتوں سے دوچار کرنا ہے۔

☆ افریقہ پہنچ جانے والے مسلمانوں میں سے دس مسلمان اسپین واپس آ کر اس بات کی تصدیق کریں گے کہ دوران سفر انہیں کسی قسم کی مشکل درپیش نہیں آئی تھی۔''

واہ سبحان اللہ! یہ ساری باتیں مزار شریف سے طالبان کے انخلا کے وقت امریکی یقین دہانیوں سے کس قدر مماثلت رکھتی ہیں۔

اس حکم نامے پر دستخط ہوتے ہی ہسپانیہ میں مسلمانوں پر قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ کم و بیش تین لاکھ مسلمان اپنی جائے رہائش سے بندرگاہوں کی طرف ہانکتے ہوئے قتل کیے گئے۔ انخلا کے اس فیصلے کے یکساں اطلاق سے مسلمان متاثرین کی تعداد کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بیشتر مورخین نے اس تعداد کو 30 لاکھ ہی قرار دیا ہے۔ مشہور مذہبی محقق ڈبلیو سی براؤ نلی نے اس تعداد کو دو مختلف طرح سے لکھا ہے تاہم ان کی مہیا کردہ تعداد اندلس میں مسلمانوں کی تخمین کردہ تیس لاکھ افراد کی تصدیق کرتی ہے۔

غرناطہ سے سر ساحل ہسپانیہ کے راستوں پر قبروں کی تعداد نامعلوم ہونے کے

باوجود تین لاکھ سے کم نہیں ہے۔ اس راہ گزر کے مسافریوں بھی زیادہ سیاہ بخت تھے کہ ان کے پاس نہ وقت تھا نہ مہلت۔ مہلت وہ ضائع کر چکے تھے اور وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ان کے پاس صرف تین دن تھے۔ انہیں اس وادی ہول سے نکلنے اور مملکت موت کا حصار بہتر گھنٹوں میں توڑنا تھا۔ ان کی صعوبت سخت، آزمائش کڑی اور چال قیامت کی تھی۔ انہیں ہانکنے والے گر جانے والوں کی تعداد کے مطابق قبریں نہیں کھودتے تھے بلکہ قبریں کھود کر اتنے گرا لیتے تھے۔ لوہے کا آنکڑہ برچھی کے آگے جڑا ہوتا جو پیچھے سے زن زناتا ہوا آتا اور گردن کے آر پار ہو جاتا جسے گردن کاٹے بغیر نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ ضرب اتنی شدید اور بے ساختہ ہوتی کہ مرنے والے کو کلمہ پڑھنے کی مہلت بھی نہ دیتی۔

سقوط اندلس اسلام پر عیسائیت کی، رواداری پر نسلی امتیاز کی اور فراخدلی پر تنگ نظری کی ایک ہزار سال میں یہ پہلی فتح تھی سو اپنی خون آشامی میں بدترین اور نتائج میں ہولناک تھی۔ سقوطِ اندلس کے نتیجے میں مسلمان جس ابتلا، آزمائش، المیے اور ہزیمت سے دوچار ہوئے اس کا نوحہ لکھتے ہوئے مشہور شاعر ابوالبقاالرندی نے اسے قیامت کی چال باندھا اور کہا کہ مسلمان اسے کبھی نہیں بھولیں گے۔ سقوطِ اندلس پر ابوالبقاء الرندی کا زور بیان انتہائی اثر انگیز اور دل گیر ہے لیکن اس کا کیا کیجیے کہ ابھی سقوط کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ مصر، ترکی اور ملک شام سے مسلمان امیروں کے سفارت کار ملکۂ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے دربار میں خیر سگالی کے پیغامات پہنچانے کے لیے شرف باریابی کے منتظر بیٹھے رہتے تھے۔ ہمیں قرائن کے برعکس اُمیدیں رکھنی چاہیے کہ صدر پرویز مشرف ان سے مختلف حکمران ہوں گے، ان جیسے نہیں۔ سقوطِ اندلس جو شاعر خوش توقع کے نزدیک بھلایا ہی نہیں جا سکتا تھا حیران کن حد تک مسلمانوں کو یاد تک نہ رہا اور اس سبق آموز سانحے سے عبرت کا ایک ماشہ بھی برآمد نہ کیا جا سکا۔ اگر کیا جا سکتا تو مسلم اُمہ مزید سقوط، پناہ، مہاجرت، نقل مکانی، بے

دخلی اور خود سپردگی سے محفوظ رہی ہوتی۔ پہلی اور مرکزی عبرت یہ تھی کہ ہم ہسپانوی عیسائیوں کا مزاج سمجھ کر ان کی تاریخ و کردار پر نظر رکھتے مگر آج تک اس طرف توجہ ہی نہیں دی گئی کہ امریکا کن لوگوں کے وارثوں کی سرزمین ہے؟

امریکا ان لوگوں کی سرزمین ہے جن کی فطرت کا ناشکراپن، حرص، ہوس اور مذہبی انتہا پسندی امریکا پہنچتے ہی اپنی بدترین صورت میں عریاں ہوگئی۔ نئے براعظم میں لنگر انداز ہوتے ہی ہسپانویوں نے وافر زرعی زمینوں، پانی کی بہتات، جنگلات اور وسائل کی افراط پر کلمہ شکر ادا کرنے کی بجائے زیادہ سے زیادہ سونا، چاندی جواہرات، غلام، سفلی خواہشات کی تکمیل، حق ملکیت اور مال منفعت کے حصول پر قتل غارت کا بازار گرم کر کے ناشکری کی انتہا کردی۔ امریکی سرزمین میں ہسپانویوں کے ہاتھوں کاشت کی گئی زبردستی، جنسی بے راہروی، استحصال اور مادیت کی افراط نے ایسے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد رکھی جو محض دوسو سالوں میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ موجودہ امریکی معاشرت اور معیشت کی اساس عین انہی عناصر پر استوار ہوئی جو ہسپانوی غاصب اس زمین میں کاشت کر گئے تھے۔ اب ہم ان سے خیر کی توقع رکھیں تو ہماری سادگی پر کوئی مرے نہ مرے، ہمیں یہ خودکشی کرتے ہوئے کسی پر الزام نہیں دھرنا چاہیے۔

ابوعبداللہ نے سرِ دست اپنی جان بچالی تھی لیکن اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ قصہ بڑا عبرت آموز ہے۔ طارق بن زیاد نے کہا تھا: ''اے لوگو! بھاگنے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہارے پیچھے سمندر ہے اور تمہارے سامنے دشمن! میں اللہ پر قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے پاس صرف اخلاص ہے یا صبر۔''

امیر عبداللہ کے پاس اخلاص تھا نہ صبر اور نہ ہی بھاگنے کا راستہ...... وہ راستہ بناتے بناتے خود راہگزر بن گئے۔ جس جاگیر کے لیے وہ غرناطہ دینے پر رضامند ہو چکے تھے وہ ان

سے لے لی گئی۔ جس جاہ وحشم کے وہ پرچائے ہوئے تھے اس کا آخر آن پہنچا تھا۔ 1496ء میں انہیں اندلس سے دیس نکالا ملا تو وہ مراکش میں اپنے ددھیالی عزیز کے پاس مقیم ہوئے۔ 1536ء میں اپنے میزبان کی طرف سے لڑتے ہوئے دریا بکوبا کے کنارے وہ اس حالت میں جاں بحق ہوئے کہ چڑھے ہوئے دریائے بکوبا کے کنڈے پر ان کی لاش پڑی تھی۔ گھوڑے اور سپاہ جو اس دریا کو عبور کرتے تھے ان کی لاش پر پاؤں رکھتے، روندتے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ ان کی تدبیر یوں اُلٹی کہ راستہ بنانے اور گنجائش نکالنے کی خواہش شاقہ نے انہیں دوسروں کی راہگزر بنا دیا تھا۔ تاریخ نے ہمارے لیے مٹی کے مہینے کی بیک وقت شجاعت، حمیت، اخلاص، حیلہ گری اور ہوس جاہ کے حوالے سے اپنے صفحوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا کہ جس کے آغاز میں 12 ہزار کی سپاہ سرفروش نے لاکھ کے لشکر کو آناً فاناً گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ (1965ء کو ذہن میں رکھیے) اس کے آخر میں 35 ہزار سپاہ کے موجود ہوتے ہوئے ابوعبداللہ بغیر لڑے غرناطہ حوالہ کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ (کوئی حرج نہیں اگر آپ یہاں سقوطِ ڈھاکہ دسمبر 1971ء کو دُہرالیں)

اندلس کا قصہ بس اس قدر جانیے کہ اس میں اسی قدر وقت لگا کہ جتنا اول مئی سے آخر مئی تک لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس آخر کے آنے میں آٹھ صدیاں لگ گئیں۔ طارق بن زیاد نے جو بات اپنے لشکریوں سے کہی تھی بظاہر تو وہ الہامی کلمات نہیں لگتے لیکن نو صدیوں بعد جب مسلمانوں کو اندلس سے بے دخل کیا گیا تو ابن زیاد کا کہا لفظ لفظ پورا ہو کر رہا۔ مسلمانوں کے لیے بھاگنے کا واقعی کوئی راستہ نہیں تھا۔ ان کے سامنے سمندر تھا اور پیچھے دشمن...... صبر ان پر تمام ہو چکا تھا اور اخلاص رُخصت، انہیں کہیں بھی پناہ نہیں تھی۔ سو ابن زیاد کا اندیشہ پورا ہو کر رہا۔ وہ ہجوم در ہجوم قتل ہوئے۔ انبوہ کے انبوہ سمندر میں ڈوب گئے۔ کلمہ گو خلق سرزمین اندلس سے نابود ہوگئی۔ 22 ستمبر 1609ء کو ویلنسا کے عیسائی بادشاہ

فلپ سوئم نے جب اندلس سے مسلمانوں کی جبری بے دخلی کا حکم جاری کیا تو انہیں اندلس چھوڑنے کے لیے تین دن کی مہلت دی تو نو صدیوں کے ساکنانِ اندلس کو ترکِ اندلس کے لیے دیا گیا وقت بہت کم تھا۔ اتنے وقت میں وہ صرف قتل ہو سکتے تھے یا ڈوب سکتے تھے۔ سو وہ قتل ہو گئے جو قتل ہونے سے بچ رہے تھے، انہیں سمندر نے نگل لیا۔ 25 ستمبر تک 1609ء بہر حال اسپین مسلمانوں کے وجود سے آزاد ہو چکا تھا۔

حکمرانوں کی طرف سے احکامِ الٰہیہ سے منہ موڑنے کی سزا پوری قوم کو کاٹنا پڑی۔ اللہ نہ کرے کہ پھر کبھی ایسا وقت آئے۔ اللہ تعالیٰ مہلت ختم ہونے سے پہلے توبہ کی توفیق اور مُہر لگنے سے پہلے واپس آجانے کی عقل نصیب فرمادے۔ آمین

لنچنگ: امریکا کا قومی کھیل

دنیا کے مختلف ممالک میں قومی نشان، قومی پرچم، قومی پھول وغیرہ کی طرح قومی کھیل بھی ہوتے ہیں۔ امریکا دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک سمجھا جاتا ہے۔ اس کا قومی کھیل کیا ہے؟ امریکا کے بارے میں دستیاب کتب یا نیٹ پر جائیں تو اس کا جواب کچھ اور لکھا ملے گا لیکن ہم آپ کو ایسے کھیل سے متعارف کروائیں گے جو امریکا میں انتہائی شوق سے کھیلا جاتا تھا اور اب اس کھیل پر بظاہر پابندی ہے لیکن شوق کی تکمیل کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا؟ لہٰذا امریکی بھی یہ شوق کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیتے ہیں۔ اس کھیل کے قواعد وضوابط اور ہار جیت کی تفصیل سمجھنے کے لیے ''جم کرو قوانین'' کو سمجھنا ہوگا۔

1860ء سے 1960ء تک (جی ہاں! 1960ء تک) جب امریکا مسلمان ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر پریشان اور بے چین رہتا تھا۔ امریکا کے طول وعرض میں پوری ایک صدی تک ایسے قوانین نافذ تھے جو اس قدر شرمناک اور غیر انسانی تھے کہ ان سے زیادہ ظالمانہ قوانین اس وقت کرۂ ارض پر کہیں اور نافذ نہیں ہوں گے۔ ان قوانین کا پس منظر یہ تھا کہ امریکا میں ایک انتہائی شرمناک کاروبار زوروں پر تھا۔ افریقہ کے ساحلی ملکوں

ماریطانیہ، تنزانیہ، کانگو، موزمبیق، نمیبلا، انگولا، سینیگال، گنی گیانا، گھانا، نائیجریا اور جنوبی افریقہ سے اغوا کر کے سیاہ فام افراد بالجبر غلام بنا کر لائے جاتے تھے اور ان سے جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسلام میں غلامی کے قوانین اور غلاموں کے متعلق دی گئی ہدایات اتنی اعلیٰ وارفع ہیں کہ جنگی قیدیوں کے لیے اس سے بہتر نظام انسانی تاریخ میں کسی نے وضع کیا نہ وضع کیا جا سکتا ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والوں کے سرخیل امریکا میں حال یہ تھا کہ آزاد انسانوں کو بالجبر قید کر کے لا لا کر بیچا جاتا تھا۔ جب غلاموں کی آزادی کی تحریک نے زور پکڑا (اس تحریک میں پیش پیش وہ افریقی مسلمان تھے جنہیں اغوا کر کے افریقا سے امریکا لایا گیا تھا) اور غلامی کے اس بھیانک کاروبار پر پابندی لگی تو سفید فام امریکیوں کے اندر چھپی عصبیت اور تکبر نے ان سیاہ فام مظلوموں کو آزاد تسلیم کرنے کے باوجود برابری کا درجہ دینے سے انکار کر دیا۔ اسلام میں تو غلامی کی حالت میں کوئی بھی غلام مسلمانوں کا امام یا سپہ سالار بن سکتا ہے لیکن انسانی حقوق کے علمبردار امریکا میں آزاد ہو جانے کے بعد بھی غلاموں کے بارے میں ایسے غیر انسانی قانون وضع کیے گئے جو امریکا کے لیے باعث شرم ہوں یا نہ لیکن انسانیت کے لیے عار کا باعث ضرور ہیں۔ ان قوانین کو ''جم کرو قوانین'' کا نام دیا گیا تھا اور ان کے بطن سے اس شیطانی کھیل نے جنم لیا جو اس کالم کا موضوع ہے۔

آئیے! ذرا ایک نظر بے رحم اور سنگدل امریکی شرفا کے وضع کیے ہوئے ''تکریم انسانیت'' پر مبنی ان روشن خیال قوانین پر ڈال لیں۔ واضح رہے کہ ''جم کرو کوڈ'' نامی یہ قوانین باقاعدہ امریکی قانون ساز اداروں نے عوامی نمایندوں کی کثرت رائے سے منظور کیے تھے اور 1965ء تک امریکا میں علی الاعلان و بالاطمینان نافذ رہے ہیں۔

☆ سیاہ فام مرد سفید فام مرد سے مصافحہ کے لیے ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔ چونکہ اس سے سماجی حیثیت کی برابری کا اظہار ہوتا ہے۔ ☆ سیاہ فام مرد سفید فام عورت سے مصافحہ کے

لیے اپنا ہاتھ دراز نہیں کرسکتا چونکہ اس سے زنا بالجبر کی ترغیب مل سکتی ہے۔ ☆ سیاہ فام وسفید فام اکٹھے بیٹھ کر نہیں کھا سکتے۔ اگر ایسا ہو تو سفید فاموں کو کھانا پہلے پیش کیا جائے گا اور دونوں کے درمیان حد فاصل قائم رکھی جائے گی۔ ☆ کسی بھی صورتِ حال میں سیاہ فام مرد سفید فام عورت کی سگریٹ جلانے کے لیے اپنا لائیٹر روشن نہیں کرے گا اس طرز عمل سے اپنائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ☆ سیاہ فاموں کو ہمیشہ سفید فاموں سے متعارف کرایا جائے گا کیونکہ سفید فاموں کو سیاہ فاموں سے متعارف ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ☆ سفید فام، سیاہ فاموں کے لیے کسی احترامی سابقے یا لاحقے کو استعمال نہیں کریں گے بلکہ انہیں ان کے پہلے نام سے مخاطب کریں گے جبکہ سیاہ فام سفید فاموں کو سر، مسٹر، مسز اور میڈم سے مخاطب کریں گے۔ ☆ اگر سفید فام گاڑی چلا رہا ہو تو سیاہ فام اس کے برابر نہیں بیٹھے گا بلکہ پچھلی نشستوں پر بیٹھ سکے گا۔ ☆ سفید فام ڈرائیور کو پہلے گزرنے کا حق حاصل ہے۔

ان بنیادی ضابطوں کے علاوہ ریاست تا ریاست ایسے قوانین منظور کیے گئے جو سراسر نسلی تعصب اور نسلی امتیاز پر مبنی تھے۔ اور جن کو توڑنے پر سنگین سزائیں مقرر تھیں۔ مثلاً:

☆ سیاہ فام حجام کسی سفید فام خاتون یا نوعمر لڑکی کے بال نہیں تراش سکتے۔ (ریاست جارجیا) ☆ نابیناؤں کے ہسپتال میں سیاہ فام اور سفید فام نابینا اکٹھے نہیں رکھے جا سکتے۔ دونوں کے لیے علیحدہ عمارت کا انتظام ہوگا۔ (ریاست لوئزیانا) ☆ سفید فاموں کو سیاہ فاموں سے علیحدہ دفنایا جائے گا۔ دونوں کے قبرستان مختلف ہوں گے۔ ☆ سیاہ فام وسفید فام مسافروں کے علیحدہ ٹکٹ گھر، علیحدہ نشستیں، علیحدہ انتظار گاہ اور علیحدہ غسل خانے ہوں گے۔ (ریاست الباما) ☆ کوئی سفید فام کسی سیاہ فام بچے کو لے پالک نہیں بنا سکتا نہ ہی اس کو سفید فام بچوں کی نگرانی کے لیے رکھ سکتا ہے نہ ہی سفید فام بچوں میں انہیں شامل کرسکتا ہے۔ (ریاست جنوبی کیرولائنا) ☆ سفید فام اور سیاہ فام بچوں کے سکول علیحدہ ہوں گے

دونوں کو ایک ہی چھت تلے تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ (ریاست فلوریڈا) ☆ لائبریریز میں سیاہ فام اسی مخصوص حصے میں بیٹھ سکیں گے جو ان کے لیے مخصوص ہوگا۔ (ریاست شمالی کیرولائنا) ☆ ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں اور قیام گھروں میں سفید اور سیاہ فام اکٹھے نہیں رکھے جا سکتے۔ (ریاست جارجیا) ☆ ریاستی افواج میں سیاہ فام اور سفید فام علیحدہ رکھے جائیں گے دونوں ایک ہی جگہ خدمات انجام نہیں دے سکتے۔ سیاہ فام یونٹس پر لازماً سفید فام آفیسر متعین کیے جائیں۔ (ریاست شمالی کیرولائنا) ہسپتالوں میں جہاں سیاہ فام مریض داخل ہوں گے وہاں سفید فام نرسز تعینات نہیں کی جا سکتیں۔ سیاہ فام و سفید فام قیدی علیحدہ رکھے جائیں گے، ہر دو کے رہائشی کمروں کے درمیان حد فاصل قائم رکھی جائے گی۔ (ریاست مسی سپی) ☆ اصلاحاتی اسکولز میں سفید فام اور سیاہ فام طلباء کو لازماً علیحدہ رکھا جائے گا۔ (ریاست کنٹاکی) ☆ ایسے اساتذہ جو سیاہ فاموں اور سفید فاموں کو اکٹھے پڑھانے کے مرتکب پائے جائیں انہیں سخت سزا دی جائے گی۔ (ریاست اوکلوھاما) ☆ سیاہ فام اور سفید فام آپس میں بلیرڈ نہیں کھیل سکتے۔ (ریاست الباما) ☆ طعام گھروں اور ریسٹورنٹس میں سفید فام اور سیاہ فام علیحدہ بیٹھیں گے اور ساتھ نہیں کھا سکتے۔ (ریاست الباما) ☆ سفید فام اور سیاہ فام اسکولوں کی کتابیں ایک سے دوسرے اسکول میں نہیں بھیجی جا سکتیں خصوصاً سیاہ فام طلبہ کی کتابیں وہیں رہیں گی۔ (ریاست شمالی کیرولائنا) ☆ سینما گھروں، سرکس اور دوسرے تفریحی مقامات پر ہر دو کے داخلی دروازے ٹکٹ گھر اور نشستیں علیحدہ علیحدہ ہوں گی۔ (ریاست لوئزیانا) ☆ ایسی رہائشی عمارتیں جن کے کسی بھی حصے میں سفید فام مقیم ہوں وہاں پر سیاہ فاموں کو رہائش دینے والوں پر سخت سزا کا اطلاق ہوگا۔ (ریاست لوئزیانا) ☆ سیاہ فاموں کے لیے علیحدہ لائبریریز ہوں گی۔ وہ سفید فاموں کی لائبریریز سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ (ریاست ٹیکساس) ☆ سیاہ فام و سفید فام مرد و زن کے درمیان رشتہ

ازدواجی قائم نہیں کیا جا سکتا۔(میری لینڈ مسی سپی، ویومنگ، فلوریڈا، ایری زونا)
(نیشنل ہسٹارک اسٹاف لسٹ:1998)

''جم کروقوانین'' کا نفاذ تشدد سے کیا گیا اور اس سے مزید تشدد نے جنم لیا۔

سیاہ فام جو اِن قوانین کو توڑنے کے مرتکب پائے جاتے مثلاً: سفید فاموں کے پانی پینے کی مخصوص جگہ سے پانی پینا یا اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا یا کسی سفید فام سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانا، ان پر جم کروقوانین کی خلاف ورزی کی سزا عائد ہو جاتی۔ سفید فاموں کو سیاہ فاموں پر جسمانی تشدد کرنے کی قانونی اجازت حاصل ہونے کی وجہ سے سفید فام اپنے طور پر ہی سیاہ فاموں کے مذکورہ ''جرائم'' کے فیصلے کر کے سزائیں دے دیتے۔ یوں بھی سیاہ فاموں کی کہیں شنوائی نہیں تھی چونکہ جم کروقوانین کے عہد میں پولیس، استغاثہ، جج، عدالتیں، صدر، جیوری اور جیل حکام سفید فاموں پر مشتمل تھے۔ سو ایک طرف تو انصاف سے محرومی نے سیاہ فاموں کو قانون شکنی پر اُبھارا اور دوسری طرف سفید فام خود کو منصفی کا اہل سمجھتے ہوئے سیاہ فاموں کو براہ راست سزائیں دیتے اور سزاؤں کا ہولناک ترین پہلو ''لنچنگ'' تھا۔

لنچنگ وہ ہولناک کھیل تھا جسے 1870ء کی دہائی میں جم کروقوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب سیاہ فاموں کو سزائیں دینے کے لیے سفید فاموں نے ایجاد کیا تھا۔ اس سفید فام لنچنگ مافیا میں وہ لوگ شامل تھے جو سفید فام برتری اور ''خالص سفید فام نسل'' کے پرزور حامی تھے۔ شہر شہر سفید فاموں پر مشتمل اس جرائم مافیا نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان لوگوں کے فوری انصاف فوری سزا کے فلسفے نے سو سال تک امریکی سیاہ فاموں کو دہشت سے دوچار کیے رکھا۔ یہ ''انصاف مافیا'' جس کو بھی چاہتی پکڑ لیتی۔ گلے میں پھندا ڈالتی اور پھانسی دے دیتی۔ پھانسی دینے کے بعد لٹکتی لاش کو آگ لگا دیتی۔ تالیاں بجاتی۔ سیٹیاں مارتی اور قہقہے لگاتی پکنک سے غائب ہو جاتی۔ پھانسی دینے کے اس عمل کو ''لنچنگ'' کہا جاتا۔

لنچنگ کی اصطلاح دراصل کرنل چارلس لنچ کے نام سے اخذ کی گئی۔ امریکی خانہ جنگی (1861 1865) کے دوران کرنل لنچ نے کنفیڈریٹ آرمی کے مخبروں، برطانوی حکومت کے خیر خواہوں اور امریکی وفاق کے مخالفین کو اپنے طور پر سزائیں دینے کا عمل شروع کیا۔ یہیں سے لنچنگ کا لفظ اور نظریہ مقبول عام ہوا اور سیاہ فاموں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔

لنچنگ کی سزاؤں سے ہزاروں بے گناہ سیاہ فاموں کے ساتھ ساتھ ان سفید فاموں کو بھی عوامی پھانسی دی گئی جو غلامی کے خلاف یا جم کرو قوانین کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے تھے۔ ان سزاؤں نے سفید فام سرشت میں پوشیدہ حیوانی اور بے رحمانہ جبلّت کو عریاں کردیا۔ نازک اندام سفید فام دوشیزائیں، کم سن بچے، جوان امریکی مرد جنہیں روشن خیال، مہذب، تعلیم یافتہ اور جمہوری کہا جاتا تھا لٹکتی لاشوں پر تالیاں مارتے، تھوکتے، آگ لگاتے اور لطف اندوز ہوتے۔ اس میں اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کہ اگر افغانستان میں انسانوں کو کنٹینرز میں دم پخت کرنے والوں کی سفاکی نے لنچنگ کی ہولناکی سے جنم لیا ہو۔ لنچنگ کے بارے میں درج ذیل حوالوں سے لنچنگ کی وجوہات، طریق کار، حکومت کا ردِعمل اور معاشرتی پستی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''19 جولائی 1935ء کو روبن اسٹیسی نامی سیاہ فام نوجوان کو جبکہ اسے پولیس کی بھاری معیت میں میامی (فلوریڈا) جیل لے جایا جارہا تھا، وائٹ مافیا نے اسے پولیس سے چھین کر میرین جونز نامی خاتون کے گھر کے پاس درخت پر پھانسی دے دی۔ میرین جونز کی شکایت پر روبن اسٹیسی زیرحراست تھا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ میرین جونز کی عصمت دری کرنے کے ارادے سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ بعد میں ''نیویارک ٹائمز'' نے اصل حقائق پر پردہ اٹھاتے ہوئے انکشاف کیا کہ روبن اسٹیسی درحقیقت ایک بے گھر اور مفلس کسان تھا

جو چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی کو کرایہ پر لے کر کاشت کاری سے بسر اوقات کرتا تھا۔ وہ میرین جونز سے کچھ خوراک مانگنے اس کے گھر گیا جبکہ میرین جونز اسے دیکھ کر گھبرا گئی اور اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ اس پر روبن اسٹیسی کو گرفتار کر لیا گیا اور اگلے روز اس کی ''لنچنگ'' کر کے میرین جونز کو انصاف مہیا کر دیا گیا۔ (نیویارک ٹائمز: 1935)

روبن سٹیسی کی المناکی پر اخبار اپنے فیچر میں لکھتا ہے: ''علاقے کی تمام نمایندہ سماجی شخصیات وہاں موجود تھیں جن میں عورتیں اور بچے خصوصاً لنچنگ سے لطف اندوز ہونے آئے تھے۔ اونچی سوسائٹی کی خواتین ہجوم کے پیچھے پیچھے چلتی آئیں جبکہ قرب و جوار سے مزید عورتیں ہجوم میں شامل ہوتی گئیں۔ جونہی نیگرو کا بے جان لاشہ درخت سے زمین پر گرایا گیا، ہجوم نے پھانسی دی جانے والی رسی کو سوغات کے طور پر حاصل کرنے کے لیے زور آزمائی شروع کر دی۔ بالآخر قریب ایک فٹ رسی تین چار ڈالر میں بیچی گئی۔''

درختوں پر جھولتی ہوئی سیاہ فام لاشوں سے امریکا کا کوئی حصہ محفوظ نہیں تھا۔ فوری انصاف اور فوری سزا دینے والے سفید فام گروہ سیاہ فام ملزموں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ لنچنگ میں ہر طرح کے جرم کی سزا ایک ہی تھی...... پھانسی۔ ڈبل روٹی چرانے والے کو پھانسی اور سفید فاموں کو دیکھ کر احتراماً نہ کھڑے ہونے پر بھی پھانسی۔ سیاہ فام کسی طرح بھی محفوظ نہیں تھے۔ ان کے خلاف با آواز بلند الزام لگانا ہی کافی تھا۔ انہیں صفائی کا موقع دیا جاتا نہ نام نہاد ہی سہی انصاف کے عمل سے گزارا جاتا۔ اس صورت حال پر اخبار چارلسٹن گزٹ نے 1918ء میں اپنے اڈیٹوریل میں لکھا: ''آخر وہ نیگروز کو لنچ کیوں کر رہے ہیں جبکہ سفید فام جج، سفید فام جیوری، سفید فام عوامی ردِ عمل اور سفید فام پولیس کی موجودگی ہی کافی ہے۔ نیگروز جن پر الزام لگایا جاتا ہے یا جن پر کسی جرم کا شبہ کیا جاتا ہے وہ تو ویسے بھی سفید فاموں کے ''انصاف'' سے نہیں بچ سکتے۔''

چارلسٹن گزٹ اسی ایڈیٹوریل میں سیاہ فام فوجیوں کی لنچنگ کے بارے میں رقم طراز ہے: ''شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو کہ اخبارات میں نیگرو فوجیوں کی لنچنگ کی کوئی خبر نہ شائع ہوتی ہو کہ انہیں ان کی وردی میں لنچ کر دیا گیا ہے۔کون سیاہ فام ہے جو محفوظ ہو۔''

1882ء سے 1968ء تک امریکا کے طول وعرض میں چار ہزار سات سو بیالیس افراد کو لنچنگ کے حوالے سے غیر قانونی اور انسانیت سوز طریقے سے پھانسی دی گئی۔ان میں سے 73فیصد افراد سیاہ فام تھے جبکہ امریکی آبادی کا وہ صرف نو فیصد تھے۔ان 73فیصد کے 78 فیصد کو پھانسی سے پہلے شدید ترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ 21فیصد کی پھانسی کے بعد لاشیں نذرآتش کی گئیں۔اکثر واقعات میں لاش اور پھانسی دی جانے والی رسی کے ٹکڑے تماش بینوں میں سوغات کے طور پر بانٹے گئے۔(ایمری اینڈ ایمری:1996) لنچنگ کی سزا پانے والوں کے لیے مجرم ہونا ضروری نہیں تھا بلکہ سیاہ بختوں کے لیے سیاہ فامی کے ساتھ ساتھ حالات کی زد پرآ جانا کافی تھا۔

جب چند تجسس پسند صحافیوں نے بھیانک ترین سزائے موت پانے والے سیاہ فاموں کے ''جرائم'' آشکارا کیے تو امریکا سے یورپ تک سنسنی پھیل گئی۔وہ جن کی اکثریت کو سفید فام خواتین کی آبروریزی کا مجرم قرار دے کر لنچ کیا جاتا تھا تحقیق سے سامنے آیا کہ ان کا جرم آبروریزی نہیں بلکہ سیاہ فامی تھا۔کورچشمی سے دیکھے جانے کے باوجود جن جرائم پر سیاہ فاموں کو انسانی تاریخ کی بدترین سزائیں دی گئیں۔ان جرائم پر کم از کم امریکا میں سزائے موت مروج نہیں تھی۔سفید فاموں کی ظالمانہ سرشت، بے رحمانہ فطرت اور ہوس بھرے رویے کا نتیجہ یہ تھا کہ جن سیاہ فاموں کو لنچ کیا گیا ان میں سے ایک تہائی پر لگائے گئے الزامات بے بنیاد اور جھوٹے تھے۔

مشہور امریکی ماہر عمرانیات جیمز کٹلر 1905ء میں امریکا کے قومی جرم کی نشان دہی کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے ملک (امریکا) کا قومی جرم لنچنگ ہے۔''

قومی پھول، قومی پرندے، قومی رقص اور قومی کھیل کی طرح لنچنگ کو قومی جرم قرار دینا جرأت مندی کا کام تھا۔ ایک ایسا جرم جو قومی سطح پر مقبول اور جسے دہشت گرد مافیا، ریاستی حکومتوں، عدلیہ، پولیس اور مقامی انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی جبکہ وفاقی حکومت اس کھیل میں بارہویں کھلاڑی کی حیثیت سے پورے طور پر شریک تھی۔ اس شراکت کے ایک سو ایک ثبوت موجود ہیں لیکن سب سے بڑا ثبوت ایک سوال کی صورت میں ہے جن کا جواب 1946ء سے امریکی حکومت پر واجب الجواب ہے۔ یہ سوال لینن انعام یافتہ سیاہ فام ادیب اور سول رائٹس لیڈر پال رابنسن نے صدر ہیری ٹرومین سے با آواز بلند، مجمع عام میں ڈنکے کی چوٹ پر پوچھا تھا جس کا جواب ہنوز شرمندہ جواب ہے۔ 12 ستمبر 1946ء کو میڈیسن اسکوائر گارڈن نیویارک میں ایک احتجاجی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے پال رابنسن نے سوال اٹھایا:

''پریزیڈنٹ ٹرومین! لنچنگ کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اس خباثت کے بارے میں کچھ کہنے سے کیوں قاصر ہیں؟ وفاقی حکومت آخر کب ایسے اقدامات کرے گی جن سے ہمارے آئینی حقوق کی ضمانت کا تحفظ ہو سکے؟ اگر اس ملک کے لیڈر گودی ملازمین اور ریلوے ورکرز کے خلاف آرمی اور نیوی کو طلب کر سکتے ہیں تو وہ لنچرز (پھانسی دینے والوں) کے خلاف آرمی اور نیوی کو کیوں طلب نہیں کر سکتے؟''

پال رابنسن جس جواب کی توقع لگائے ہوئے تھے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ صدر ہیری ٹرومین کے پیشرو صدر فرینکلن روز ویلٹ اس کا جواب پہلے ہی دے چکے تھے کہ لنچنگ کے خلاف وفاقی اقدامات سفید فاموں کو ناراض کر دیں گے اور وہ انتخاب

ہار جائیں گے۔ یوں تو امریکا میں لنچنگ کا آخری سانحہ 1946ء میں ورجینیا میں ہوا جس میں چار سیاہ فاموں کو بے دردی سے ہلاک کیا گیا لیکن 1946ء کے بعد امریکا سے لنچنگ ختم ہو جانے پر امریکیوں نے دوسرے ملکوں میں اپنے قومی کھیل کی مشق جاری رکھی۔ چونکہ امریکی حدود سے باہر لنچنگ امریکی قانون کے تحت کوئی جرم نہیں ہے سو اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی نسلِ انسانی امریکی قومی کھیل کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہے۔ فلپائن، جاپان، ویت نام، کوریا، کمبوڈیا، افغانستان اور عراق کو جس طرح Lynchized کیا گیا ہے، تاریخ کے صفحوں اور انسانی ضمیر کے نہاں خانے میں یہ ان شاء اللہ ضرور محفوظ رہے گا اور کائناتی تکوینی قوانین کے تحت وہ وقت ضرور آئے گا جب اس کھیل میں شریک امریکی کھلاڑی جوابی اننگ کا سامنا کریں گے۔

آنسوؤں کی شاہراہ

امریکا انسانی حقوق کا چیمپئن کہلاتا ہے۔ اسے انسانوں سے زیادہ انسانی حقوق کی فکر رہتی ہے۔ دنیا میں کتنی ہی قومیں اور ملک ایسے ہیں جن کے بنیادی حقوق امریکا نے انسانی حقوق کی بحالی کے نام پر اس بری طرح سے پامال کیے کہ دنیا میں جب تک انسانیت کا لفظ بولا جاتا رہے گا انسانیت شرمسار، سرنگوں اور نادم رہے گی...... آج کے کالم میں ہم اس امر کا مطالعہ کریں گے کہ امریکا کا کردار خود امریکا میں انسانی حقوق کے حوالے سے کیسا رہا ہے؟ اس کے لیے ہمیں امریکا کی ریاست ٹینیسی کی بستی کیلاہون میں جانا پڑے گا جہاں سال 1836ء کے ماہ جون میں امریکا کی دریافت سے لے کر آج تک کا المناک ترین سانحہ پیش آیا۔

6 جون 1838ء کو کیلاہون ریاست ٹینیسی میں سورج طلوع تو ہوا مگر سرنگوں و شرمسار۔ اس دن کے طلوع سے ایسی شرمساری وابستہ تھی کہ جب غروب ہوا تو اپنے پیچھے ڈھیر ساری سیاہی چھوڑ گیا۔ اس قدر سیاہی کہ انسانی و امریکی تاریخ کا یہ بدنما المیہ لکھنے کے لیے کئی صدیاں بھی کم نہیں پڑیں گی۔ 26 مئی 1830ء کو امریکا کی اکیسویں کانگریس صدر

اینڈریو جیکسن کے دباؤ میں ریڈ انڈینز کی زمینوں میں سونا دریافت ہونے کے بعد یہاں سے ان کی جبری بے دخلی کے لیے ''نقل مکانی ایکٹ'' پاس کر چکی تھی اور اس کے اطلاق کا اختیار امریکی صدر کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ مئی 1838ء میں صدر امریکا وان بیورن اپنے اس صوابدیدی اختیار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس ایکٹ کے مطابق براعظم امریکا کے اصل باشندوں جو ریڈ انڈینز کے نام سے پکارے جاتے تھے، کو دریائے مسی پی کے مشرق سے بے دخل کر کے مسی پی کے مغرب میں ریڈ انڈینز کے لیے مخصوص کردہ ''انڈین علاقے'' اوکلوہاما میں منتقل کرنا تھا تاکہ سفید فاموں کو ریڈ انڈینز کی سونا اُگلتی زمینوں پر مالکانہ قبضہ حاصل ہو جائے اور یہاں کی معدنیات پر ان کی ٹپکتی رال اور حرص وہوس کی تسکین ہو سکے۔

اپریل 1838ء میں امریکی صدر وان بیورن نے آرمی ٹروپس کو یہ حکم جاری کیا کہ اس ایکٹ کے نفاذ کی تیاریاں شروع کر دی جائیں جس کا مطلب یہ تھا کہ نقل مکانی کے اس سیاہ قانون کو بذریعہ طاقت نافذ کیے جانے کی ساعت بد آن پہنچی ہے۔ اس جارحیت کا آغاز 6 جون 1838ء کی صبح کیلاہون ریاست ٹینیسی کی بستی سے ہوا۔ ریڈ انڈینز کے مشہور قبیلے ''چیروکیز'' کی یہ بستی جو صدیوں سے امن و آشتی کا مرکز رہی تھی چشم زدن میں لہولہو ہوگئی۔ سات ہزار سفید فام فوجی سنگینیں تانے کیلاہون پر حملہ آور ہوئے اور مکینوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح مسی سپی کے مغرب میں ہانکنا شروع کر دیا۔ اس افراتفری میں بچے ماؤں سے اور گھر کے افراد ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ کسی کو سامان اٹھانے کی مہلت دی گئی نہ کسی کو الوداع کہنے کی۔ جس نے مزاحمت کی وہ قتل ہوا اور جس پر تاخیر کرنے کا شبہ ہوا وہ گرفتار۔ فوجی لوٹ مار میں اور افتادگان گریہ وزاری میں مصروف ہو گئے۔ ایک ہزار میل لمبے سفر پر روانگی کے لیے کوئی تیاری تھی نہ زادِ راہ۔ حکومت کی طرف سے جو بیل

گاڑیاں مہیا کی گئیں وہ کم پڑ گئیں اور گھوڑوں پر فوجی خود چڑھ گئے۔ گرفتارِ بلا اوسطاً دس میل روزانہ پیدل چلتے۔ چلتے چلتے جب دو ماہ بیت گئے تو بھوک، نقاہت، شدید سردی اور بیماریوں نے آ لیا۔ ہر دو چار قدم پر کوئی ایسا گرتا کہ پھر اٹھ نہ سکتا۔ ان نہ اٹھنے والوں کو بلا تاخیر وہیں دفنا دیا جاتا۔ یوں مسی سپّی سے اوکلوہاما تک اس طویل راستے پر جگہ جگہ قبریں وجود میں آ گئیں۔ مرنے والوں کے لواحقین پیچھے مڑ کر دیکھتے۔ انہیں یاد کرتے، روتے محوِ سفر رہنے پر مجبور تھے۔

اس بے کسی کے سفر نے امریکی تاریخ میں ''آنسوؤں کی شاہراہ'' کو جنم دیا۔ قدم قدم پر قبروں اور لحہ لحہ گریہ سے ایک ایسا المیہ وجود میں آیا کہ جس میں آنسو، آہیں، درد وفغاں اور خون کے ساتھ ساتھ امریکی جمہوریت، انسانی حقوق، انصاف، آئینی حرمت اور ذہنی ترقی کے خوش رنگ وعدے بھی مٹی میں مل گئے۔ اس نقل مکانی کے نتیجے میں بننے والی چار ہزار قبروں نے اقوام عالم پر امریکی اندرون آشکارا کر کے جمہوریت اور انسانی حقوق کے امریکی ڈھول کی پول کھول کر رکھ دی۔

عالمی کلاسیکی ادب پر اگر تحاریک، ادوار اور شخصیات نے اثر ڈالا ہے تو سانحات نے بھی اسے متاثر کیا ہے۔ شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ، سقوط غرناطہ، ریڈ انڈینز کی نسل کشی، المیہ ویت نام اور آنسوؤں کی شاہراہ ان سانحات میں سرِفہرست ہیں جن کے نتائج وعواقب سے بیش بہا کلاسیکی ادب تخلیق ہوا۔ ان سانحات نے ایسے حزنیہ شہ پاروں کو جنم دیا جنہیں عالمی کلاسیکی ادب میں امتیاز حاصل ہے۔ ریڈ انڈینز، جن کی نسل کشی اور قتل عام کی وجہ ان کا غیر مہذب ہونا قرار دیا گیا تھا انہی ریڈ انڈینز نے ''آنسوؤں کی شاہراہ'' کے المیہ پر ایسا ادب تخلیق کیا جس سے ادبیات عالیہ کے صفحات نم اور انسانی ضمیر کی آنکھ نمناک ہو گئی۔ مشہور ریڈ انڈین شاعر چیف ڈان جارج کی درج ذیل نظم ادبی کلاسیک کے

اسی زمرے میں شامل ہے:

''میں دیکھتا ہوں اور روتا ہوں''

اس یخ بستہ اور ویران راستے پر

جس کے انچ انچ اور قدم قدم پر

بھوک سے بلکتے اور

سردی سے شریانوں میں منجمد خون سے

نیلائے ہوئے جسموں کو گھسیٹتے ہوئے

میرے معصوم بچوں کی چیخیں ایستادہ ہیں

لاغر و لاچار ماؤں کے آنسو بکھرے ہیں

اس راستے پر ایک ایک جھاڑی کے تلے

میری نسل اور قبیلے کے بے گناہ

قتل ہونے والے

بچوں، عورتوں اور مردوں کی

قبریں پوشیدہ ہیں

میں یہ دیکھتا ہوں اور روتا ہوں

کہ میرے اجداد کی وسیع زمینوں میں

ہماری قبروں کے نشان بھی باقی نہیں رہیں گے

امریکی سفید فاموں کا اپنے ہی ملک کے اصل باشندوں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک منظر عام پر اتنی تفصیل سے نہ آتا اگر جان برینٹ جیسے لوگوں کی گواہی نہ ہوتی۔ جان برینٹ ان عسکریوں میں شامل تھا جنہیں 6 جون 1838ء کی صبح کیلا ہون کے چیروکیز کو مغرب کی

طرف ہانکنے اور جارجیا کی اراضی پر ان کی ملکیت تاراج کرنے کا اذن دیا گیا تھا۔ جان برینٹ 1890ء میں اپنی تفصیلی گواہی میں کہتا ہے: ''میں آج گیارہ دسمبر 1890ء کو اسّی برس کا ہوگیا ہوں۔ میں کنگز آئرن ٹینیسی میں پیدا ہوا تھا اور شکار کھیلتا، مچھلیاں پکڑتا، سیر و تفریح کرتا جوان ہوگیا۔ جوان ہوا تو آرمی میں چلا گیا۔ شکار کی تلاش میں جنگلوں اور ویرانوں میں مجھے بہت سے چیروکیز سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے دوست بن گئے۔ میں ان کے شکار میں شریک ہو جاتا اور ان کے کیمپ میں ہی رات گزار لیتا۔ میں نے ان کی زبان سیکھی اور انہوں نے مجھے شکار کرنے کے جال، پھندے اور کڑکی بنانا سکھائی۔ 1838ء میں جب چیروکیز کو ان کے آبائی گھروں سے بے دخل کیا گیا تو میں ایک نوجوان فوجی تھا۔ چیروکی زبان جاننے کی وجہ سے مجھے مئی 1838ء میں ترجمان بنا کر موکی ماؤنٹین کے چیروکیز کے علاقے میں تعینات کر دیا گیا۔ یہاں میں نے امریکی تاریخ کے بدترین احکام پر عمل درآمد ہوتے دیکھا۔ وہاں میں نے بے بس چیروکیز کو ان کے گھروں سے گھسیٹتے ہوئے نکالے جانے اور گرفتار ہوتے دیکھا۔ انہیں میرے سامنے بھیڑ بکریوں کی طرح بیل گاڑیوں میں لاد کر مغرب کی سمت ہنکا دیا گیا۔ کوئی بھلا اس دن کی اداس اور نوحہ گر کیفیت کو کیسے بھول سکتا ہے کہ جب لوگوں کو ان کے گھروں سے گھسیٹتے وقت جوتے تک پہننے کی مہلت نہیں دی گئی تھی۔ بچوں کو ایک بیل گاڑی سے دوسری بیل گاڑی میں اپنے ماں باپ کو الوداع کہتے دیکھنا دل دوز منظر تھا۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہے ہیں۔ 17 نومبر کو درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے گر چکا تھا اور برف باری شروع ہو چکی تھی۔ شدید سردی کی یہ صعوبت 26 مارچ 1839ء تک جاری رہی حتیٰ کہ چیروکیز اوکلوہاما تک پہنچ ہی گئے۔ شاہراہ جس پر نقل مکانی کے متاثرین محوِ سفر تھے درحقیقت شاہراہِ موت میں بدل چکی تھی۔ زیرِ حراست افتادگان کھلے آسمان تلے زمین پر سونے پر مجبور تھے۔ میں نے

ایک ہی رات میں بائیس افراد کو شدید سردی اور نمونیہ سے مرتے دیکھا۔ مرنے والے انہی افراد میں چیف جان راس کی جواں سالہ عیسائی بیوی بھی شامل تھی۔ یہ نیک دل عورت سردی میں اس وجہ سے ہلاک ہوئی کہ اس نے اپنا کمبل ایک بیمار بچے کو سردی سے بچانے کے لیے دے دیا تھا۔ برف کے شدید طوفان میں وہ اس طرح مردہ پائی گئی کہ اس کا سر لیفٹیننٹ گریگ کے گھوڑے کی کاٹھی پر بے حس وحرکت رکھا ہوا تھا۔

میں اس تمام لمبے سفر میں چیروکیز کے ہم رکاب رہا اور ہر ممکن جو ایک سپاہی کے بس میں تھا، میں نے ان کے لیے کیا۔ میں جب بھی رات کے پہرے میں متعین کیا جاتا تو میں آنکھ بچا کر اپنے اوورکوٹ سے بچوں کو گرمائی پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا۔ جس رات مسز جان راس کا انتقال ہوا اس رات بھی میں پہرے پر متعین تھا۔ مسز راس کی لاش کو صبح سویرے سڑک کے کنارے ایک گڑھے میں دفنا کر ہم عازم سفر ہو گئے۔ چیروکیز پر جو مظالم ڈھائے گئے اس کی بنیاد میں ان کی زمینوں سے سونا ملنے کی توقع کے ساتھ ساتھ ان کی سونا اگلتی زمینوں پر قبضے کی طمع بھی شامل تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کے گھر جلا دیے گئے۔ جوان مردوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی املاک لوٹ لی گئیں۔ مرد جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ عورتیں جو حملہ آوروں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھیں انہیں زمین پر گھسیٹتے ہوئے گھروں سے باہر نکالا گیا۔ بچے اپنے ماں باپ سے جدا کر دیے گئے اور انہیں ایک ایسے سفر پر روانہ کر دیا گیا جس میں آسمان ان کا کمبل اور زمین ان کا بچھونا تھی۔

میں نے ایک گھر میں یہ دل فگار منظر بھی دیکھا کہ ایک ناتواں عورت جو دل کا دورہ پڑ جانے سے حالت نزع میں تھی۔ ایک بچہ اس کی پیٹھ پر بندھا تھا جب کہ دو بچوں کو اس نے ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ گری اور گرتے ہی غموں سے آزاد ہو گئی لیکن بچے اس کے مردہ جسم سے چمٹے ہوئے تھے اور اسے چھوڑتے نہیں تھے۔ ریڈ انڈینز قبیلے کے سردار چیف

جونالسکا جس نے امریکی خانہ جنگی کی مشہور جنگ ''ہارس شو'' میں امریکی صدر اینڈریو جیکسن کی جان بچائی تھی، کی نظر جب اس منظر پر پڑی تو آہستگی سے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور آسمان کی طرف دیکھ کر گویا ہوا: ''اے میرے خدا! اگر مجھے ہارس شو کی جنگ میں یہ پتہ ہوتا جو میں آج جانتا ہوں تو امریکا کی تاریخ مختلف طرح سے لکھی جاتی۔''

1890ء میں چیروکیز کی نقل مکانی ابھی پرانی بات نہیں ہوئی ہے کہ ہمارے بچے ان گھناؤنے جرائم کا ادراک نہ کر سکیں جو ایک ناتواں نسل کے خلاف کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے بچوں سے حقائق چھپائے جا رہے ہیں۔ آج کے بچوں کو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ ہم اس زمین پر رہتے ہیں جسے سفید فاموں کی طمع کی خاطر ایک کمزور اور ناتواں نسل سے سنگینوں کے زور پر حاصل کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں یہ پڑھیں گی اور ایسے عمل کی مذمت کریں گی جیسا کہ مجھ جیسے کم حیثیت سپاہی اور چار دوسرے ریڈ انڈین سپاہیوں کو جنرل اسکاٹ کے احکامات کے دباؤ میں ایک ریڈ انڈین سردار اور اس کے بچوں کو گولی مارنا پڑی تھی۔ ہمارے پاس اعلیٰ افسران کے احکامات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

میں انتہائی یقین سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے اپنے طور پر چیروکیز کے لیے ہر ممکن وہ سب کچھ کیا جس کی دوستوں سے توقع رکھی جاتی ہے۔ جبری نقل مکانی کے پچاس سال بعد بھی میں ان کے حافظے میں ''سپاہی جو ہم سے حسن سلوک رکھتا تھا'' کے حوالے سے محفوظ ہوں۔ تاہم قتل قتل ہے چاہے وہ کسی خون آشام سے اندھیرے میں سرزد ہو یا مارشل میوزک کے انتروں پر رقص کرتے ہوئے وردی پہنے فوجیوں سے۔ قتل قتل ہے اور کسی نہ کسی کو اس کا جواب دینا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی تو 1838ء میں ریڈ انڈین خون کی بہائی ندیوں کا جواب

دے۔ کسی نہ کسی کو آنسوؤں کی شاہراہ پر چیروکیز قبائل کی ان چار ہزار خاموش قبروں کی وضاحت کرنی چاہیے جو ان کی جبری بے دخلی پر وجود میں آئی ہیں۔

میری خواہش ہے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں لیکن یخ بستہ زمین پر 645 بیل گاڑیوں کا قافلہ جس میں انسانیت سسک رہی تھی میرے حافظے پر حاوی ہو چکا ہے۔ مستقبل کے مورّخ کو یہ المناک کہانی مع اس کی دل زدگی و آہوں کے بیان کرنا ہوگی۔ روئے زمین کے عظیم منصفین ہمارے افعال کا جائزہ لے کر ہمیں اسی کے مطابق جزا دیں گے۔"

جان برنیٹ کی آدھی بات تو پوری ہوگئی کہ مورّخ نے اس المناک کہانی کو کھول کھول کر بیان بھی کر دیا ور ادیب نے اس المناک کہانی سے وابستہ دل زدگی و آہیں بھی مقدور بھر آشکارا کر دیں لیکن آدھی بات پوری ہونا ابھی باقی ہے۔ ابھی روئے زمین کے منصفوں کا فیصلہ آنا رہتا ہے۔ فیصلہ آ جائے تو سزا و جزا کا تعین بھی ہو۔ اس میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے۔

کچھ فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیے

انسانی حقوق کی بات جانے دیجیے کہ اس میں حقوق کے ساتھ ساتھ سیاست اور مفادات کا پیچ بھی لگا ہے لیکن امریکا میں انسانوں کی جس قدر مٹی پلید ہوئی ہے، انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس زمین پر سرمایہ داری، کاروبار، منافع، اراضی، موقع، قبضہ، داؤ، اثاثے، ملکیت، فروخت، خوشحالی، سودے پھیلاؤ اور خالص مال مفادات کے لیے جس بے دردی سے انسانی خون بہا ہے اور انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوئی ہے اس کے پیش نظر انسانی حقوق پر امریکی اصرار اس قدر معتبر ہے کہ جس طرح جاپان میں ایٹم بم سے ڈیڑھ لاکھ افراد قتل کرنے کے بعد ایٹمی ہتھیاروں کو محدود کرنے کا عندیہ۔ امریکا کی

تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو جب تک اس میں ''آنسوؤں کی شاہراہ'' جیسے واقعات کی سیاہی باقی ہے، اس کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانی حقوق کی بات کرے یا اس کی بنیاد پر کسی پر اُنگلی اُٹھائے۔

واضح ہو کہ ریڈ انڈینز براعظم امریکا کے اصل مالک اور عیسائی تھے۔ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ محض نسلی تفاخر اور ہوس ملک گیری میں مبتلا ہو کر ایسا سنگ دلانہ سلوک کرنے والوں سے اگر کوئی یہ توقع رکھے کہ وہ کسی دوسرے ملک کے غیر عیسائی کے لیے رحم کا کوئی جذبہ رکھتے ہیں تو اس کی خوش فہمی پر اس سے اظہار ہمدردی کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

ہسپانیہ کے متعصب صلیبیوں کے منہ کو لگا خون اور آنکھوں میں جمی ہوس براعظم امریکا کے بعد اب ساری دنیا کو حقیر سمجھ کر غلام بنانے نکلی ہے۔ بے رحمی اور خونخواری امریکا اور سنگ دلی اور ہوس ناکی امریکیوں کی فطرت ہے۔ ان چیزوں کو امریکی نفسیات سے کھرچ کر نکالنے کے لیے کسی صاعقۂ آسمانی کی ضرورت ہے جو قدرت کے تکوینی فیصلوں کی فہرست میں کہیں دور نیچے ہے۔ اے میرے رب! تو حشر کیوں نہیں اُٹھا دیتا کہ مظلوموں کی آہیں ضرور تیرے عرش کو ہلائے دے رہی ہیں۔

ورجینیا: منڈیوں سے یونیورسٹیوں تک

امریکا کی ریاست ورجینیا کی ایک یونیورسٹی میں ایک پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ قاتل نے جس طرح مرتب انداز میں سلیقے کے ساتھ طلبہ واساتذہ کو قطار میں کھڑا کر کے مشرف بہ قتل کیا ہے، اس کے پس منظر اور عوامل جاننے کے لیے ماہرین نے اپنے اپنے طور سے مخصوص روایتی انداز میں قیافے لگانا شروع کرر کھے تھے...... کسی نے اسے فلم بینی کا اثر کہا اور کسی نے عشقِ نامراد کو موردِ الزام ٹھہرایا مگر اب خود ''رنگ دار'' ایشیائی قاتل نے یادگار میں چھوڑی ویڈیو کے ذریعے ''بزبان وتصویر خود'' حقیقی سبب کا اعتراف کرلیا ہے۔ خبر کے مطابق کورین قتل باز نے نفرت سے بھر پور ویڈیو پیغامات چھوڑے ہیں۔ ایک امریکی ٹی وی کے مطابق نوجوان کا ویڈیو پیغام امریکا میں دولت مند لوگوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وہ ان امیر لوگوں سے بدلہ لے گا۔ ویڈیو تصاویر اور تحریروں پر مبنی مواد کا پیکٹ ٹی وی کے نیویارک دفتر میں اس وقت پوسٹ کیا گیا جب ورجینیا ٹیک کالج میں فائرنگ کا پہلا واقعہ رونما ہوا تھا۔ ادھر ورجینیا پولیس کے سپر نٹنڈنٹ نے پریس کانفرنس میں کہا کہ ملزم کے بھیجے گئے مواد کو ایف بی آئی کے حوالے کر دیا گیا ہے جس میں

تفتیش کو ایک ''نیا رُخ'' ملے گا۔ دریں اثنا اطلاع ہے کہ اس طرح کے اور واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں۔ امریکی ریاست میسوری کی ایک یونیورسٹی میں فائرنگ کے ایک اور واقعے میں دو افراد ہلاک ہو گئے جبکہ دھمکیوں اور بم کی اطلاعات کی وجہ سے ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں خوف کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ادھر کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ہیٹنگ لا کالج اور منی سوٹا یونیورسٹی میں بم کی افواہ پر عمارتیں خالی کرالی گئیں۔ دنیا حیران ہے کہ مہذب امریکیوں کے مہذب ترین تعلیم یافتہ افراد کیا کیا سے کیا ہوتا جا رہا ہے؟ کیا یہی وہ قابلِ تقلید روشن مثالیں ہیں جن کی پیروی کی امریکا ساری دنیا سے توقع رکھتا ہے۔ اس اعترافِ حقیقت نے امریکا اور امریکیوں کی نفسیات پر نظر رکھنے والوں کے لیے فکر و نظر کے نئے دریچے کھول دیے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ امریکا جیسے ملک میں جہاں جانوروں کے حقوق بھی مسلم و محترم ہیں، ایک تعلیم یافتہ شخص کو مراعات یافتہ طبقے کے خلاف اس قدر شدت سے نفرت کا اظہار کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ اس کے لاشعور میں چھپا کون سا ایسا آتش فشاں جیسا قوی محرک تھا جس نے اسے اس طرح کی سنگین کارروائی پر اُبھارا ہے؟ یہ معاملہ ایسا گھمبیر ہے کہ امریکا کی بنیاد، اس کی ساخت اور امریکی سائیکی میں موثر مرکزی عوامل کو دیکھے بغیر انصاف کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکے گا۔ قارئین اگر زحمت فرمائیں اور کچھ دیر کے لیے توجہ مرکوز رکھیں تو یہ گتھی سلجھائی جا سکتی ہے اور اس کے سلجھنے سے پاکستانی قوم کے ذہن میں امریکیوں کے بارے میں بہت سی اُلجھنیں، سُلجھنوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

☆......☆......☆

ریاست ورجینیا کسی زمانے میں افریقہ سے لائے ہوئے غلاموں کی امریکا میں نیلام کی سب سے بڑی منڈی ہوتا تھا۔ یہاں ظلم و جبر کے جو بیج بوئے گئے ہیں ان کے نتائج بد کا احساس امریکی دانش وروں کو کافی پہلے ہو گیا تھا۔ مشہور امریکی فلاسفر، سیاسی دانشور اور

مصنف رالف ایمرسن نے 1855ء میں اپنی شہرۂ آفاق تقریر میں اس کا یوں اظہار کیا: ’’میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا معاشرہ جو بیک وقت ظالمانہ بھی ہو اور خود کو مہذب بھی کہتا ہو، ریاست کیسے تخلیق کر سکتا ہے؟ ہمیں یا تو غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا یا آزادی سے۔‘‘

انہوں نے جب درج بالا خیالات کا اظہار کیا تو وہ امریکی حکومت اور امریکی معاشرے کی اس دورُخی پر تنقید کر رہے تھے جہاں بیک وقت آزادی بھی موجود تھی اور غلامی بھی۔ انسانی حقوق اور جمہوریت کے ساتھ ساتھ جبریہ خدمت گار، نسلی منافرت اور دوسرے درجے کے شہریوں کی موجودگی امریکی آئین کا مذاق اُڑا رہی تھی۔ رالف ایمرسن کے خیال میں ایک ہی معاشرے میں غلامی اور آزادی، ظالمانہ سماج اور مہذب معاشرے کی بیک وقت موجودگی ممکن العمل ہی نہیں تھی لیکن امریکا میں یہ ناممکن بھی ممکن ہو گزرا ہے کہ امریکی آبادی کا دس فیصد مستقلاً غلاموں پر مشتمل ہونے کے باوجود امریکا خود کو جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کا چیمپئن سمجھتا تھا۔ امریکی آبادی کے اس دس فیصد کو افریقہ سے اغوا کر کے لایا گیا تھا اور سیاہ فام وسیاہ بختوں کو بھیڑ، بکریوں کی طرح خریدا اور بیچا گیا تھا۔ اس کی ضرورت امریکا میں نقل مکانی کر کے گئے ہوئے یورپین سفید فاموں کو یوں پڑی کہ انہوں نے جب امریکا کی مقامی آبادی ریڈ انڈینز کی ساڑھے تین لاکھ مربع میل زمین ہتھیا لی تو اس کے بعد اگلا مرحلہ اس زمین پر کاشت کاری کا تھا۔ جس طرح زمین مفت میں حاصل کی گئی تھی اسی طرح اس زمین پر بلا معاوضہ کام کرنے والے بھی ڈھونڈ لیے گئے۔ جبریہ بیگار کے لیے غلاموں کی ضرورت افریقیوں کے اغوا سے پوری کی گئی۔ ان اغوا کاروں میں ولندیزی، برطانوی، پرتگالی، سویڈش اور ہسپانوی سرفہرست تھے۔ انہوں نے 40 ملین کے قریب افریقی باشندوں (جن میں کئی ملین مسلمان تھے) کو جہازوں میں جانوروں کی طرح بھر بھر کر لایا اور امریکا میں لا کر نیلام کیا۔ ان میں 30 ملین راستے میں

مرگئے۔ گویا ایک افریقی غلام کو امریکا پہنچانے کے لیے تین کو راستے میں مارا گیا۔ اس طرح امریکا کی اساس انسانی خون کی ارزانی پر استوار ہوئی۔ (1) پہلے تو امریکا کی بنیاد رکھنے والوں کی اسلام دشمنی تمیں لاکھ اندلسی مسلمانوں کے سر لے گئی تھی۔ (2) پھر اس کی تعمیر کے مرحلے میں یورپی آبادکار امریکیوں نے سوملین ریڈ انڈینز کو تہ تیغ کیا۔ (3) اس کے بعد 40 ملین افریقی باشندوں کو بھینٹ چڑھایا گیا۔ امریکا کی معاشی ترقی کا ڈالر ڈالر لاکھوں افریقیوں کے خون سے آلودہ ہے جس میں افریقی مسلمانوں کا لہو بھی شامل ہے۔ ہوس زر، جوع الارض اور جاہ کی خاطر اتنے وسیع پیمانے پر قتل و غارت کی کوئی اور مثال انسانی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ کرسٹوفر کولمبس کے قدم امریکی زمین پر پڑتے ہی دو براعظم افریقہ اور امریکا خون میں نہا گئے۔ امریکا کے 100 ملین ریڈ انڈینز اور افریقہ کے 40 ملین سیاہ فام انسانیت کے بدترین ظلم کا شکار ہو گئے۔ امریکا میں غلامی کی بنیاد کرسٹوفر کولمبس نے اپنے دست نحس سے خود رکھی۔ انسانوں کی نقل و حمل اور خرید و فروخت کا سابقہ تجربہ اس کے بہت کام آیا۔ ولندیزی برطانوی اور ہسپانوی بردہ فروشوں نے اس کارِ بد کو آگے بڑھایا اور امریکیوں نے اسے انتہا اور عروج پر پہنچا دیا۔

امریکا میں غلامی کی تاریخ 3 نومبر 1493ء سے شروع ہوتی ہے۔ آج کے دن کرسٹوفر کولمبس جب امریکا کے دوسرے سفر سے اسپین واپس پہنچا تو اس کے جہازوں میں تائینو قبائل کے سات سو ریڈ انڈینز محبوس تھے جنہیں وہ امریکا سے واپس آتے ہوئے اغوا کر لایا تھا۔ اسپین کے شاہی دربار میں کولمبس کو جرم بردہ فروشی پر پھانسی دیے جانے کی بجائے اس کی تحسین کی گئی جس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ادھر اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا تھا، ادھر اسپین اور امریکا میں غلاموں کی تعداد۔ سال 1502ء کی کسی بدساعت میں گردن اور پاؤں میں بندھی رسیوں سے گھسیٹتے ہوئے پہلے افریقی غلام کو امریکا کے ساحل پر اُتارا گیا۔

اس بدنصیب سیاہ فام کو وان ڈی کورڈوبا نامی بردہ فروش نے ہسپانوی دربار کی اجازت سے امریکا میں فروخت کی غرض سے ارسال کیا تھا۔ اسی اثنا میں کولمبس کا بیٹا ڈیاگو کولون جسے ہسپانوی حکومت نے جزائر غرب الہند (وسطی امریکا) میں اپنا گورنر مقرر کیا تھا وہ ریڈ انڈینز غلاموں کی کارکردگی سے نالاں تھا۔ اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ریڈ انڈین غلام اس قدر محنتی اور مخلص نہیں ہیں جتنی کہ وہ توقع رکھتا ہے۔ ڈیاگو کولون کی مسلسل شکایتوں کے جواب میں ہسپانیہ کے عیسائی بادشاہ فرڈی نینڈ نے 22 جنوری 1510ء کو پچاس افریقی غلاموں کا دستہ چین سے سانتو ڈومینگو (ڈومینکن ری پبلک) روانہ کیا جہاں ان افریقی غلاموں کو براہِ راست گورنر کولون کی زیرِ نگرانی گنے کی کاشت پر مامور کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس بادشاہ فرڈی نینڈ نے امریکا میں غلاموں کی برآمد پر ہسپانوی حکومت کی عائد کردہ پابندیاں ختم اور طریق کار سہل کر دیا۔ گورنر کولون ریڈ انڈین غلاموں کی نسبت افریقی غلاموں کو زیادہ محنتی اور جفاکش سمجھتا تھا لیکن افریقیوں کی اسی جفاکشی کی شہرت نے انہیں امریکا میں ایسی پروڈکٹ بنا دیا جس کے حصول کے لیے ہر حربہ اختیار کیا گیا۔ ہر ظلم روا رکھا گیا۔

غلاموں کی موجودگی کی تین صدیوں میں امریکی زمین انسانیت کے شرف سے محروم اور حیوانیت کے ننگ سے دوچار رہی۔ حقارت، درشتی، ظلم اور تذلیل کے امریکی ساحل پر گھسیٹے جانے والے اس پہلے افریقی غلام کا کوئی نام نہیں تھا۔ اس کا شمار جہاز پر موجود اشیا میں کیا گیا تھا۔ اس کا اندراج سامان کے نگ کے طور پر ہوا تھا۔ علم نفسیات کی جدید تحقیق اور نئے نظریے کے مطابق فرد کا ماضی سے ناطہ کاٹ دینا انفرادی اور امتیازی شناخت مٹانے کی خشتِ اول جس پر اس کا شدید ردِ عمل فطری اور منطقی ہے۔ اس سائیکی کے تحت افریقی غلاموں کو سب سے پہلے ان کے ذاتی اور قبائلی ناموں سے آزاد کیا گیا پھر خاندانی اکائی کی ریخت عمل میں آئی۔ بیٹی نیویارک میں نیلام کی گئی اور بیوی مشی گن میں...... بیٹا

بالٹی مور میں بکا اور بھائی ٹیکساس میں...... اس کے بعد غلاموں کو اپنی زبان، ثقافت، مذہب، رواج اور تہذیب کے بوجھ سے آزاد کیا گیا۔ نتیجتاً رنج بھرا، انتقام آمادہ، ماضی سے بے نیاز، مستقبل سے لاپروا اور بقائے ذات کے مدار میں سرگرداں ایک ایسا ''سیاہ فام'' تخلیق ہوا جو آج کے امریکا سے اپنے اجداد کی بلامعاوضہ محنت کی پائی پائی مع سود وصول کر رہا ہے۔ وہ کبھی امریکی معاشرے سے ان زیادتیوں کا جواب طلب کرتا ہے جو اس کے اجداد پر روا رکھی گئیں اور کبھی سفید فاموں کے اس تشدد کا جواب مزید تشدد سے دیتا ہے جس سے اس کی روح گھائل، سراپا زخم زخم اور عزت نفس تار تار ہوئی تھی۔ امریکا کے ماہرین معاشرتی و عمرانی اُمور، ماہرین نفسیات و اصلاح کار سالوں سے سر پکڑے یا سر جوڑے بیٹھے ہیں کہ اب اس کا کیا علاج کریں کہ امریکا میں سیاہ فاموں کی موجودہ تعداد امریکی آبادی کا محض 12 فیصد ہے لیکن امریکی جیلوں میں سیاہ فاموں کی شرح 47 فیصد ہے جبکہ 16 سال سے 37 سال کی عمر کے دوران 71 فیصد سیاہ فام مرد کم از کم ایک بار جیل جا چکا ہے۔ یہ شرح سیاہ فاموں کے اس انتقام بھرے اور مزاحمتی رویے کو ظاہر کرتی ہے جو امریکی سیاہ فام کیمسٹری میں نمایاں ہے۔

امریکا میں غلاموں کی طلب اس قدر وحشیانہ تھی کہ عیسائیت کے پاپائے اعظم سے لے کر امریکی صدر تک، عدلیہ کے اراکین سے لے کر بردہ فروشوں تک اور اہلِ قلم سے لے کر اصلاح کار تک بلاامتیاز منصب و احترام غلامی کے حق میں سینہ سپر تھے اور غلامی کے ثمر سے مستفید ہو رہے تھے۔ ان مستفید ہونے والوں میں پہلے امریکی صدر اور بابائے امریکی قوم جارج واشنگٹن بھی شامل تھے۔ صدر جارج واشنگٹن کے بعد مزید 12 امریکی صدور بھی سینکڑوں سیاہ فام غلاموں پر مالکانہ حقوق رکھتے تھے۔ کرسٹوفر کولمبس کے امریکی ساحل پر قدم رکھتے ہی امریکی زمین ایک ایسے المیے سے دوچار ہوئی کہ یہاں نظریہ، اُصول اور

انصاف پر کاروبار منافع اور منفعت غالب آ گئی۔ کولمبس کا مطمحِ نظر اس زمین سے زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ سمیٹنے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ سے اس کا یہی معاہدہ طے ہوا تھا کہ وہ نئی دنیا سے سونا، چاندی، معدنیات، غلام اور مال و زر لا کر خوش حالی کے انبار لگا دے گا۔ کوسٹوفر کولمبس اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کامیابی کی قیمت میں سو ملین ریڈ انڈینز کی ہلاکت اور ان کی لاکھوں ملین ایکڑ زمین پر غاصبانہ قبضے کا غیر انسانی فعل بھی شامل تھا۔ امریکا کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس کی دریافت اور قیام میں کسی نظریے، اُصول، انصاف اور حق کو قائم کرنا ہرگز نہیں تھا۔ امریکا کی دریافت سے لے کر آزادی تک صرف ایک ہی نظریہ موجود رہا ہے جسے آسان ترین لفظوں میں ''نظریہ ہوس منفعت'' کہا جا سکتا ہے...... کاروبار، سودے، خرید و فروخت...... جن مقاصد کے لیے امریکا وجود میں آیا تھا وہ پورے ہوئے۔ یہاں کاروبار پھلا پھولا، سودے سرِعام ہوئے اور سرمایہ دارانہ نظام کا وہ جادو سر چڑھ کر بولا جس کے نتیجے میں چو سینگ جیسے نوجوان قطار ماری کر رہے ہیں۔

امریکی زمین کبھی کسی اُصول، نظریے، حق اور انصاف سے روشناس نہیں ہو سکی۔ چونکہ یہ ملک کاروبار کے لیے وجود میں لایا گیا تھا سو یہاں ''سیلز'' ہر شے پر حاوی ہو گئی۔ پروڈکٹ کا بول بالا ہوا۔ امریکی ماؤں نے ایک سے ایک سیلز مین جنا۔ امریکا کی دریافت کا نعرہ چونکہ شرح سود، شرح منافع اور سرمائے کی شرح واپسی کی زبان میں لکھا گیا تھا سو یہاں یہی پڑھا گیا، یہی سمجھا گیا اور اسی پر عملدرآمد ہوا۔ امریکا میں اُصول، نظریے، حق اور انصاف کا مالی منفعت اور کاروبار سے مشروط ہو جانا خود امریکا کے لیے بھی اور اقوامِ عالم کے لیے بھی بہت بڑا سانحہ ثابت ہوا۔ اس سانحے کے بطن سے ایک ایسی دورُخی، بدتدبیری اور دوہرا معیارِ عمل میں آیا کہ اُصول کاروبار کے، نظریات مالی منفعت کے، حق حرص کے اور

انصاف مفادات کے تابع ہو کر رہ گیا۔ کاروباری انصاف، مفادزدہ جمہوریت، منفعت بھرا حق اور مفاد پرستی کا نظریہ امریکی زمین میں اس طرح سے پیوست ہوا کہ یہاں سے کبھی انصاف برائے انصاف کی آواز نہ اُٹھ سکی۔ یکساں انسانی حقوق کا نعرہ بلند نہ ہو سکا۔ نظریہ نظیر بن سکا نہ اُصول، اُصول کی اساس۔ یہ دورُخی، یہ کاروباری دباؤ یہ مفادات کوئی نیا امریکی رُخ نہیں ہے۔ کولمبس نے روزِاول سے ہی یہاں بیجا تھا۔ پانچ صدیوں میں یہ بیج پختہ ہو کر آدم خور آکاس میں بدل چکا ہے۔ اس نظریے کی رو سے حق وانصاف اسی حد تک قابلِ قبول ہے جہاں تک مالی منفعت اس کی زد میں نہ آتی ہو۔ نظریہ اور اُصول اسی وقت تک اچھے ہیں جب تک کاروبار پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔ وہی انسانی حقوق چاہییں جن کے گھٹنے پیٹ کی طرف مڑتے ہوں اور جمہوریت ایسی کہ جس میں خریدار کو خریدنے کی آزادی ہو۔ فرد ایسا جو پروڈکٹس میں امتیاز کر سکتا ہو۔ قرض لینے کا اہل ہو۔ دستخط کر سکتا ہو اور قرض اُتارنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اس امریکی ساختہ نظریے کا اطلاق بابائے قوم جارج واشنگٹن سے شروع ہو کر موجودہ صدر جارج بش تک آن پہنچا ہے اور اس وقت جاری رہے گا جب تک خدا کی دراز کی ہوئی مہلت کی رسی عذاب کی لگام میں تبدیل نہیں ہو جاتی۔

امریکی تاریخ میں اس نظریہ کی پہلی زد ریڈ انڈینز پر پڑی۔ امریکی صدور، رہنما اور مشاہیر ان کے قتل کی تو مذمت کرتے تھے اور ان کے قتل کو نامناسب بھی سمجھتے تھے لیکن ان کو قتل کیے بغیر ان کی زمین ہتھیانا بھی مشکل تھا۔ اس پہلی آزمائش میں ہی مالی منفعت نے حق وانصاف کا گلا دبا دیا نتیجتاً ایک ایسی بے عملی، دورُخی اور بے حس صورتِ حال نے جنم لیا کہ ریڈ انڈینز کی نسل کشی بھی جاری رہی، ان کی زمینوں پر قبضہ بھی ہوتا رہا اور ان کے قتل کی مذمت بھی کی جاتی رہی۔ آہستہ آہستہ یہی دوعملی دوہرے معیار میں بدل گئی۔

یہ دورُخی چال ایسی مہارت سے چلی گئی کہ نہ تو امریکی آئین پر کوئی حرف آیا نہ

انسانی حقوق پر شگاف پڑا۔ نہ جمہوریت پر خم آیا نہ امریکی مشاہیر کے اعلیٰ اخلاقی نظریات پر زد پڑی۔ آئین، اُصول، انصاف اور انسانیت کا بھی بول بالا رہا اور نسل کشی بھی جاری رہی۔ سفید فاموں کی زمینی ملکیت بھی ملٹی پلائی ہوئی رہی اور انسانی حقوق کے چارٹر بھی مرتب ہوتے رہے۔ اس کامیاب دورُخی اور دوہرے معیار نے اس امریکی نظریے کو پختہ کردیا کہ بات بے شک اُصول، انصاف اور نظریے کی ہی کرو لیکن اسی حد تک کہ فائدہ، مفاد اور یافت متاثر نہ ہو۔ مالی مفادات کو انصاف اور اُصول پر قربان کرنے کی بجائے انصاف اور اُصول کا خون ہوتو ہو۔ سو آج اقوامِ عالم کو انسانی حقوق اور امریکی جمہوریت کا جو بپتسما دیا جارہا ہے یہ عین اسی امریکی نظریے اور امریکی جمہوریت کے مطابق ہے جس میں مفادات اور منفعت کو بہر حال اولیت حاصل ہے۔

آج امریکا کو ہزاروں میل دور اسلامی ملکوں میں انسانی حقوق، آئین اور جمہوریت کی فکر لاحق ہے اسی امریکا میں قریب دو سو سال تک جو حشر آئین اور انسانی حقوق کا ہو چکا ہے اسے ضبط تحریر میں لانے کے لیے جس قدر سیاہ، سیاہی کی ضرورت ہے وہ ابھی ایجاد ہی نہیں ہوئی۔ آج کے خوش خیال اور فراخ دل امریکی جن کی روشن خیالی کی تقلید میں ہم اپنی خواتین کی مخلوط دوڑیں لگوا کر سمجھ رہے ہیں کہ ہم انہیں پر چالیں گے اور ہماری خواتین سے مصافحہ (یا معانقہ) کر کے وہ ہم سے راضی ہو جائیں گے، ان کے بارے میں واضح رہے کہ یہ لوگ تو رنگ دار ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے روادار ہی نہیں تھے۔ شرح سود، سیلز اور منافع کے اسیر یہ لوگ حقیقتاً اتنے روشن خیال نہیں ہیں جتنا کہ سمجھا جارہا ہے۔ سیاہ فاموں کے بارے میں بتائے گئے بدنام زمانہ قوانین اور امتیازی سلوک کے متاثرین امریکا میں آج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ابھی یہ بات اتنی پرانی نہیں ہوئی کہ اسے بھلایا جاسکے یا اس میں ابہام پیدا کیا جاسکے کہ امریکی روشن خیالی حقیقتاً کس قدر تنگ نظری سے عبارت

ہے؟ جسمانی برہنگی اور شرم گاہوں کی عریانیت کو روشن خیالی سے تعبیر کرنے والے کسی سے بھی مخلص نہیں ہیں۔ اکیسویں صدی کو جس روشن خیالی کی ضرورت ہے وہ نظریہ حفظ ما تقدم یا کسی آئینی فریم ورک کی بجائے قرآن کریم کے مقدس اوراق میں محفوظ ہے اور استعمار کے ہاتھوں ستائی ہوئی دنیا کو بالآخر اسی طرف مراجعت کرنی ہوگی۔ اس میں پناہ لینی ہوگی۔ اکیسویں صدی قرآن کی طرف مراجعت اور کلامِ الٰہی سے رہنمائی لینے کی صدی ہوگی نہ کہ مجوزہ روشن خیالی کی۔ ورجینیا کی منڈیوں میں بکتے غلاموں کی آہوں سے لے کر ورجینیا کی یورنیورسٹیوں میں بہتے خون تک سب کچھ پکار پکار کر یہی کچھ کہہ رہا ہے۔ کہاں ہیں فریب خوردہ سماعتیں! جو انقلاب کی اس آہٹ کو سن سکیں۔

ایک امریکی پروفیسر کا تجزیہ

ماہِ رمضان عبادت، تلاوت کلام اللہ، رجوع الی اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں انہی موضوعات پر بات ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں نہ وہ وجہ و مبذول کیے بغیر نہیں رہتیں۔ انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر وہ بات دس بار کہہ چکا ہے تو گیارہویں مرتبہ بھی کہہ دے اس لیے کہ ان کی سنگینی، خوفناکی اور تہلکہ خیزی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

اگر کوئی پوچھے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پُر ملال کے بعد اُمت مسلمہ کے لیے سب سے زیادہ دلدوز، المناک اور غم انگیز واقعہ کون سا ہے تو بندہ کی دانست میں اس کا ایک ہی جواب ہے: چودہ سو سال بعد ارضِ اسلام جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ کی مسلح آمد۔ اس واقعے کی وحشت ناکی اور طوفان خیزی کے سامنے ہلاکو خان کے ہاتھوں آخری عباسی خلیفہ کا قتل بھی ہیچ ہے اور ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج اور قتل عام بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ایسا خطرناک اور خوفناک واقعہ ہے کہ دونمے نامی یہودی قبیلے کے فرد کمال اتاترک کی سازشوں سے خلافت عثمانیہ کا زوال اور ہسپانیہ کے خون آشام

صلیبیوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے جارج بش کے صلیبی حملوں سے امارت اسلامیہ افغانستان کا سقوط بھی اس واقعے کے آگے گرد ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آخری وقت میں مسلمانوں کو جو چند اہم ترین نصیحتیں بلکہ وصیتیں کی تھیں ان میں سے سرفہرست یہ تھی: ''یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔'' سرزمین عرب، ارضِ اسلام ہے اس میں دو دین نہیں رہ سکتے۔ اس میں صرف اسلام ہوگا۔ غیر مسلم خصوصاً دشمنانِ اسلام کو یہاں آنے دینا اسلام اور اہلِ اسلام سے غداری کے مترادف ہے۔

عہد فاروقی میں سرزمین عرب سے یہود و نصاریٰ کے کلی اخراج کے بعد تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ 1991ء میں یہ المناک واقعہ پیش آیا کہ آلِ سعود کی حکومت کو صدام حسین کی یلغار کے تحفظ کے بہانے امریکی اور برطانوی افواج ارضِ حرمین میں آوارد ہوئیں اور آج سولہ سال گزرنے کے بعد اور صدر صدام حسین سے صہیونی انتقام کی تکمیل کے بعد بھی ٹھاٹھ سے براجمان ہیں۔ نہ واپس جانے کا نام لیتی ہیں اور نہ حرمین کے مقدس خطے کو اپنے آلودہ وجود سے خالی کرنے کا۔ اس وقت کے نجیب الطرفین نجدی سعودی حکمران یہ کہا کرتے تھے کہ ان کی آمد عارضی اور ہمارے تحفظ کے لیے ہے اور یہ افواج بھی اس خوش فہمی کی تائید میں سُر ملا کر دم ہلاتی تھیں مگر...... صاحبانِ نظر اس دن سے لے کر آج تک اس دھوکے، فریب اور ملی بھگت پر ایک لمحے کے لیے بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ خدا اور خلق خدا شاہد ہے کہ وقتاً فوقتاً ان کے خدشات کی تصدیق ہوتی رہی۔ خیبر کے متروکہ قلعوں کے قریب امریکی و برطانوی فوجیوں کے جشن واپسی اور امریکی فوجیوں کی طرف سے پانچ سالہ قیام کے بعد سعودی شہریت کے مطالبے سے لے کر جاپان کے جزیرے اوکی ناوا کے تاوانی واقعے تک خطرے کی گھنٹیاں ہیں جو مسلسل بج رہی ہیں مگر اُمت مسلمہ ہے کہ ہوش میں آ کے نہیں دے رہی۔

اوکی ناوا کی تفصیلی خبر کی طرف جانے سے پہلے ہم اپنے قارئین کو ایک مشہور روسی نژاد امریکی پروفیسر کا آج سے تقریباً بیس سال پہلے کا ایک تجزیہ سنانا چاہیں گے۔ شاید کہ مُلّا مولوی کی دہائی کی بجائے امریکی پروفیسر کے تجزیاتی اعداد و شمار دل کو لگ جائیں۔ ''پروفیسر لانا کلاشن کوف'' کو 1982ء میں تامسک اسٹیٹ یونیورسٹی سائبیریا سے جیوش آکسوڈس پروگرام کے تحت سائبیریا (روس) سے امریکا لاکر آباد کیا گیا۔ 1980ء کے شروع عشرے میں امریکی یہودیوں نے ایک انتہائی جاندار اور منظم تحریک جیوش آکسوڈس کے نام سے شروع کی۔ اس تحریک کا مقصد روسی جبر کے سرخ پنجے میں پھنسے ہوئے یہودی اسکالرز، پروفیسرز، مصنفین، محققین، مشاہیر اور اہلِ قلم و دانش کو روس سے نکال کر امریکا اور اسرائیل میں آباد کرنا تھا۔ پروفیسر لانا کلاشن کوف کا نام اور اہلیت تو مسلمہ تھی لیکن ان کے یہودی ہونے پر شک تھا۔ سو روسی حکام نے لانا کے اس دعویٰ کو مسترد کر دیا۔ چونکہ ان کے شوہر کٹر یہودی عقیدے سے وابستہ رہے تھے اور ان کے دونوں مقتول بیٹے باقاعدہ اور علانیہ یہودی رہے تھے سو انہیں بھی یہودیوں کے اس ریلے میں شامل ہونے دیا جائے جو عازم امریکا ہیں۔ یکا یک سائبیریا کے سرد زار میں ہلچل ہوئی۔ بات نکلی اور کوٹھے چڑھی۔ یہودی تنظیمیں اور انسانی حقوق کے چیمپئن پروفیسر لانا کو لے اُڑے۔ نیویارک سے پیرس اور کینیڈا سے اسرائیل تک لانا کلاشن کوف کو امریکا لانے پر زور دیا جانے لگا۔ امریکی یہودیوں کے غوغا پر امریکی حکومت کا سانس بالکل ایسے ہی اُکھڑا رہتا ہے جس طرح مہارانی اجودھا بائی کے دردِزہ پر مہابلی کا سانس اُکھڑا رہتا تھا۔ سو یہودی تنظیموں کے دباؤ میں امریکی حکومت کا دباؤ بھی شامل ہوگیا۔ اسی اثنا میں روس اپنے ٹوٹنے، بکھرنے اور ڈوبنے کے آخری مرحلے تک آن پہنچا تھا۔

ڈوبتے جہاز کا تو چوہے بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ روسی یہودی تو روسی بھی تھے اور

یہودی بھی۔ روسی شکست وریخت کی افراتفری میں ہزاروں روسی یہاں سے بھاگ نکلے اور جیوش آکسوڈس کی ہماہمی میں ہزاروں غیر یہودی بھی یہودی بن کر نکل آنے میں کامیاب ہوئے۔ انہی مشکوک یہودیوں میں ڈاکٹر لانا کلاشن کوف بھی شامل تھیں۔ امریکا میں ان لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ بڑی بڑی امریکن یونیورسٹیز کا حصہ بن گئے۔ کوئی ہارورڈ کے ہاتھ لگا۔ کوئی پرنسٹن کے۔ کوئی یونیورسٹی آف شکاگو میں سما گیا۔ کوئی اسٹینفورڈ میں۔ پروفیسر لانا کلاشن کوف نادرن الی نوائس یونیورسٹی کے ہاتھ آئیں۔ لانا کا تعلق مشہور عالم روسی جرنیل میخائل کلاشن کوف کے خانوادے سے تھا۔ وہ جنرل کلاشن کوف کی بھتیجی تھیں۔ یہ وہی جنرل کلاشن کوف ہیں جو کلاشن کوف رائفل کے موجد ہیں۔

ڈاکٹر لانا کلاشن کوف علم شماریات کے اس پہلو کے حق میں ہمیشہ خوش لسان رہیں کہ شماریات کا ایک لفظ، ایک گراف، ایک سطر، ایک ہندسہ، ایک تناسب اور ایک اوسط نہ صرف آدمی کی فوری توجہ حاصل کر لیتا ہے بلکہ اسے سنجیدہ فکری عمل کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ اپنے شماریاتی تجزیوں کا حوالہ پیش کرتی رہتیں جن پر طلبہ کا ردِعمل ہو بہو ڈاکٹر صاحبہ کے کہے کے مطابق ہوتا۔ پروفیسر صاحبہ کے پاس رونگٹے کھڑے کر دینے کو اور بھی بہت کچھ تھا۔ مگر وہ اس کا اظہار کم ہی کرتیں۔ وہ ان پروفیسرز کے برعکس تھیں کہ جو اپنے علم اور قابلیت کے معیار سے طلبہ کو پڑھاتے اور اپنی دانش کی کسوٹی پر طلبہ کو پرکھتے تھے جبکہ ڈاکٹر لانا طلبہ کے معیار اور ضرورت کو پیش نظر رکھتیں۔ البتہ اپنی بات میں جان ڈالنے اور ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی خاطر وہ وقتاً فوقتاً اپنے تحقیق کردہ اعداد و شمار، فی صد اور اوسط کو شماریات کا تڑکا لگا کر پیش کرتی رہتیں۔ ان کے چونکا دینے والے شمارتی تجزیے کچھ اس طرح ہوتے:

☆ دنیا بھر میں 21 فیصد موٹے افراد کا موٹاپا غذائی افراط اور زیادہ کھانے کی وجہ

سے ہے جب کہ دوسری طرف دنیا بھر میں عین 21 فیصد افراد ہی شدید غذائی کمی کی وجہ سے کم وزنی اور بیماریوں کا شکار ہیں۔ اگر کوئی ایسا موثر میکانزم، کوئی سسٹم بنایا جا سکے جو اس غذائی کمی کو اس غذائی افراط سے پورا کر دے تو یکا یک 42 فیصد خلقِ خدا کے مسائل حل اور بیماریاں دور ہو جائیں۔

☆امریکا میں روزانہ کوڑے میں پھینک دی جانے والی ایک لاکھ اسی ہزار ٹن قابلِ استعمال خوراک سے کرۂ ارض کے تین چوتھائی بھوکے افراد کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔

ایک امریکی شہری اوسطاً روزانہ 148 گیلن پانی استعمال کرتا ہے جبکہ دنیا بھر کی کل آبادی کے تین چوتھائی اوسطاً روزانہ 22 گیلن پانی میسر ہے۔ 2015ء کے بعد اقوامِ عالم کے درمیان نظریات، زمین، مذہب، اقتدارِ اعلیٰ اور دوسرے مفادات کی بجائے خوراک اور پانی پر میدانِ کارزار گرم ہوا کریں گے۔

☆امریکا کی آبادی کل دنیا کی آبادی کا 5 فیصد ہے لیکن یہ 5 فیصد امریکی عالمی وسائل و پیداوار کا 58 فیصد استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح عالمی آبادی کے 95 فیصد کے لیے محض 42 فیصد وسائل رہ جاتے ہیں۔ جبکہ یہی 5 فیصد آبادی عالمی وسائل کے 61 فیصد پر حقِ ملکیت رکھتی ہے۔

☆دنیا کے 5 فیصد امیر ترین لوگ عالمی دولت کے 52 فیصد پر قابض ہیں جبکہ 5 فیصد غریب ترین لوگ ایک فیصد پر ملکیت رکھتے ہیں اور ایک اور باون کا یہ تناسب ہر سال بڑھ رہا ہے۔

☆امریکا کے 300 ارب پتی خاندانوں کے اثاثوں کی مالیت دنیا کی آدھی آبادی کے مجموعی اثاثوں کے برابر ہے جبکہ کسی نامعلوم وجہ سے ارب پتی لوگوں کی تعداد میں اضافہ اور دنیا کی آدھی آبادی کے اثاثوں میں کمی ہو رہی ہے۔ اگر موجودہ تناسب برقرار رہا تو

قریب 2010ء میں ارب پتی خاندانوں کے اثاثے دنیا کی کل آبادی کے 80 فیصد اثاثوں سے تجاوز کر جائیں گے۔

☆ایک طرف امریکی ارب پتی خاندانوں کے اثاثے ملٹی پلائی ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی اس کارِ خیر میں پیچھے نہیں ہیں۔ موجودہ عشرے میں ان کمپنیز کا اوسط سالانہ منافع 500 بلین ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے جو کہ پچھلے عشرے 1970ء سے 17 فیصد زیادہ ہے؟؟؟؟۔

☆اسلحہ کی عالمی منڈی میں جس قدر سرمایہ اسلحہ کے حصول پر خرچ کیا جا رہا ہے، اس کے صرف ایک فیصد سرمایے سے پورے افریقہ کی بھوک اور ننگ کو دور کیا جا سکتا ہے۔

☆ایک امریکی شہری اوسطاً 2 جاپانی، 6 میکسیکنز، 13 چینی، 35 ہندوستانی، 400 ایتھوپین، 29 پاکستانی، 136 بنگلہ دیشی اور 315 تنزانی شہریوں کے برابر وسائل استعمال کر رہا ہے۔ جبکہ اسی امریکی کو اپنی خوراک پر اپنی آمدنی کا صرف 9 فیصد، جبکہ متعلقہ ممالک کے شہریوں کو اپنی آمدنی کا اوسطاً 72 فیصد اپنی خوراک پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ان اعداد و شمار اور تجزیوں میں دلچسپی اور تحقیق کا عنصر کس خوبی سے کارفرما ہے لیکن ڈاکٹر صاحبہ کا جو تجزیہ پڑھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جس تجزیے کی خاطر ہم نے یہ ساری کہانی چھیڑی، وہ یہ تھا:

''5 فیصد امریکی عالمی تیل کی کل پیداوار کا 25 فیصد استعمال کر رہے ہیں جبکہ امریکا کے اپنے تیل کی پیداوار اس استعمال کا صرف 40 فیصد ہے۔ امریکا میں تیل کے محفوظ ذخائر کا تخمینہ 67 بلین بیرل ہے جبکہ تیل کی سالانہ کھپت تین بلین بیرل ہے۔ اس تناسب سے 2007ء میں امریکی تیل کے کنویں خشک ہو چکے ہوں گے اور امریکیوں کے لیے اپنی معیشت کا تنفس بحال رکھنے کے لیے انتہائی اقدامات کرنا ناگزیر ہوں گے۔ ان اقدامات

میں تیل کے متبادل ذرائع کا فروغ، مشرقِ وسطیٰ میں تیل کے پیداواری ذرائع پر مشترکہ ملکیت کا دعویٰ اور عام امریکی صارف پر پیٹرول کی لازمی راشننگ، کوٹہ سسٹم کا نفاذ شامل ہوسکتا ہے۔''

اب ذرا جاپان سے آمدہ اس خبر کی طرف آتے ہیں جو اس کالم کی تحریر کا سبب بنی:

''اوکی ناوا فوجی اڈا ختم کرنے کے بدلے امریکا نے جاپان سے 23 ارب ڈالر تاوان مانگ لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکا نے یہ اڈا قائم کیا تھا جس میں ہزاروں امریکی براجمان ہیں۔ ائیر بیس اور انٹیلی جنس کا تربیتی مرکز بھی موجود ہے۔ لیز کی مدت ختم ہونے پر جاپان نے اڈا ختم کرنے کا مطالبہ کیا تو امریکا نے اڈے کی منتقلی کا خرچہ دینے کی شرط سامنے رکھ دی۔ اس مطالبہ پر جاپانی حکومت اور عوام میں زبردست اشتعال پایا جاتا ہے اور یہ جنگ عظیم دوم میں شکست کے بعد جاپانی قوم کے امریکا کے خلاف ردِعمل کا منفرد واقعہ ہے۔''

جاپانی قوم میں تو اس ناجائز مطالبے کے خلاف اشتعال پایا جاتا ہے لیکن کیا مسلم قوم میں بھی اس طرح کا کوئی ردِعمل موجود ہے جبکہ وہاں معاملہ فقط ایک غیر آباد جزیرے کا ہے اور یہاں مسئلہ مقدس ترین مذہبی مقامات کا ہے۔ مانا کہ برطانیہ کی آشیرباد سے ارضِ حجاز سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کرنے کے بعد نجدی حکمران اپنے اقتدار کی بھیک کے عوض زبانیں بند اور آنکھیں پھیر چکے ہیں لیکن کیا پوری اُمت مسلمہ بھی حرمین کے اس سودے پر خاموش رہے گی؟ سوال یہ ہے کہ کل کلاں اگر امریکی اسی طرح کا مطالبہ شاہ عبدالعزیز کے بہادر فرزندوں سے کرلیں تو ان کا جواب کیا ہوگا؟ اہلِ اسلام کو بس اس کی فکر ہے کہ آل سعود نے اس سال عمرے کے اتنے ویزے کم کردیے اور حج کے لیے فلاں فلاں رکاوٹ کھڑی کردی۔ اگرچہ یہ سب کچھ طوطے کی چونچ جیسی ناک والے نجدی حکمرانوں کی اپنی پالیسیاں نہیں، یہ مسلمانوں کا رجوع الی اللہ اور حرمین حاضری کا شغف ومحبت کم کرنے کی امریکی

ہدایات کا شاخسانہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ''خادم الحرمین الشریفین'' اگر ''خادع الحرمین الشریفین'' بن جائے اور حرمین کی خدمت کی بجائے انہیں گروی رکھنے پر تل جائے تو کیا اسے اس کی چھوٹ دی جاسکتی ہے؟؟؟ میرے پروردگار! ہم بھی کیسے دور میں جی رہے ہیں۔ جاپانیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ہتھکنڈے کی خبر سن کر لگتا ہے کہ جیسے ڈاکٹر لانا کلاشن کوف نے اپنی دھیمی آواز میں یہ بات ابھی کہی ہو: ''2007ء تک امریکیوں کے لیے اپنی معیشت کا تنفس بحال رکھنے کی خاطر انتہائی اقدامات کرنا ناگزیر ہوں گے۔ ان اقدامات میں مشرقِ وسطیٰ میں تیل کے پیداواری ذرائع پر مشترکہ ملکیت کا دعویٰ بھی شامل ہوسکتا ہے۔''

اے میری قوم! حرمین کی فریاد تجھے سناتے سناتے یہ دسواں سال ہونے کو آیا ہے۔ کیا یہ اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتی کہ اس پر اتنا کان دھرا جائے جتنا کہ رمضان کے موسمی گداگروں کی پکاروں پر دھر لیا جاتا ہے۔

امریکا کی عالمِ اسلام پر یلغار کیوں؟

یہ الفجیرہ ہے۔ بغداد کے قریب ایک مضافاتی علاقہ جہاں کے ایک بڑے گراؤنڈ میں گاڑیوں کا قبرستان بنایا گیا ہے۔ ہم نے اس سے قبل سعودیہ میں جدہ کے قریب اس طرح کے قبرستان کا تذکرہ سنا تھا جہاں سعودی امیرزادوں کے ہاتھوں کھیل کھیل میں تباہ ہونے والی نئی نویلی گاڑیاں ناکارہ ہونے کے بعد لا ڈالی جاتی ہیں۔ ان میں اکثریت دنیا بھر کی مشہور موٹر ساز کمپنیوں کی نئی نکوری زیرو ماڈل گاڑیوں کی ہوتی ہے جنہیں شیرشاہ کے مستریوں کے حوالے کیا جائے تو وہ انہیں چند دنوں میں اپنی اس حالت میں واپس لے آئیں کہ ہمارے ہاں بکاؤ جنس والے سیاست دان بخوشی اپنا ضمیر ان کے عوض گروی رکھنے پر تیار ہو جائیں۔ سعودی رئیس زادے ان کی رفتار، کارکردگی اور اُٹھان کی جانچ کے دوران اگر انہیں داغی کر بیٹھیں تو داغ مٹانے کی بجائے ان سے جان چھڑانے کو ترجیح دیتے ہیں اور یوں اس قبرستان میں ایک ''آہنی مردے'' کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس قدر اسراف اور دولت کا اتنا بے جا و بے درد ضیاع بجائے خود ایک المیہ ہے۔

لیکن الفجیرہ کے میدان میں...... جو پانچ کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے...... جمع کی جانے

والی گاڑیاں سعودی رؤسا کی طرح اسراف وتنعم اورعیش کوشی وآزادی کی اشک آور شہادت نہیں، عراقی رضا کاروں کی بے مثال جدوجہد کا لافانی استعارہ ہیں۔ یہ وہ گاڑیاں ہیں جنہیں اتحادی افواج کے خلاف حملوں میں استعمال کیا گیا۔ اتحادی افواج موقع سے حادثے کے اثرات مٹانے کے لیے فی الفور انہیں اُٹھا کر شہر کے باہر ڈمپ کر دیتی ہیں۔ جدہ کے ''موٹر قبرستان'' کی بہ نسبت اس قبرستان کی بے گوروکفن آہنی لاشوں میں اضافے کی رفتار کافی تیز ہے۔ یہ دونوں قبرستان دو الگ الگ کہانیاں سناتے ہیں۔ مستقبل کا مورخ جب آج کے دور کی تاریخ لکھے گا تو اس کے لیے ان عبرتناک داستانوں سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ دونوں قبرستان آج کے تحقیق کاروں کے لیے بھی تحقیق کا بہترین موضوع اور زورِ قلم دکھانے کا بہترین مصرف ہیں لیکن ہمارے ہاں ایسے اہل قلم عنقا ہیں جو قلم کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے اپنی نگارشات تحقیق وتعمیر فکر سے آراستہ کریں۔ گزشتہ سے پیوستہ کالم میں تذکرہ کیا گیا تھا، ان خصوصاً موخر الذکر کتاب (ہوئے تم دوست جس کے) ادب، تاریخ اور تحقیق تینوں کو اتنی خوبصورتی سے یکجا کیا گیا ہے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ان میں سقوطِ ہسپانیہ سے دریافت امریکا تک وہ اوجھل حقائق منظر عام پر لائے گئے ہیں جن سے واقفیت ہمارے عوام کا اندازِ فکر، ہمارے دانش وروں کا زاویۂ نظر اور ہمارے حکمرانوں کا رُخ قبلہ درست کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ یہ کتاب پاکستان کے بڑے بک اسٹالوں پر دستیاب ہے۔ ناشر کا فون نمبر 042-6304761، 0321-9400292 اور مصنف کا ای میل ایڈریس: h.haq@att.net ہے۔ قارئین کتاب پر اپنی آرا اور تبصرے مصنف کو براہِ راست بھجوا سکتے ہیں۔ کاش! کوئی نیلوفر بختیار صاحبہ کو بھی کتاب کا ایک نسخہ بھجوا دے۔ شاید ان کو احساس ہو کہ ان کو گلے مل کر مبارک باد دینے والے تو غیر سفید فام مخلوق سے ہاتھ ملانے کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

بات دو منفرد قسم کے قبرستانوں کی ہو رہی تھی! ہر نیا طلوع ہونے والا سورج جب ان پر اپنی کرنیں بکھیرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ شہرِ خموشاں کے باسیوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس اضافے کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے اور رواں موسم بہار میں زبردست امکان ہے کہ اس طرح کا ایک تیسرا قبرستان ہمارے پڑوس میں وجود میں آئے گا اور پہلے دو کے ساتھ مل کر ''قبری مثلث'' کو مکمل کر دے گا۔ صدر بش کو اس کا بخوبی ادراک ہے۔ آنجناب نے فرمایا ہے: ''جانتا ہوں امریکی عوام عراق جنگ سے اُکتا چکے ہیں'' دراصل وہ یہ کہنا چاہتے تھے: ''جانتا ہوں امریکی افواج جنگ سے گھبرا چکی ہیں۔'' اسی لیے انہوں نے عراق میں مزید فوجی بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جیسا باخبر شخص اور امریکا جیسی دور اندیش قوم کیوں خود کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہی ہے؟ اس سعی لاحاصل کے پیچھے کون سا نادیدہ ہاتھ یا نافہمیدہ جذبہ کارفرما ہے؟ بات یہ ہے کہ امریکا کی بنیاد جس ہوس ملک گیری پر رکھی گئی تھی وہ فطری حرص و طمع، ان کے مزاج میں رچ بس چکی ہے اور کمزور اقوام کا منہ لگا خون ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ بہت سے قارئین کو اس تجزیے میں غیر تحقیقی تبصرے یا شدت پسندی کی بُو آئے گی لیکن ان سے درخواست ہے کہ وہ جلدی نہ فرمائیں۔ امریکا کی دریافت اور پرداخت کا قصہ سننے تک صبر فرمالیں۔

12 اکتوبر 1492ء کو کولمبس اپنے قیافے کے مطابق ایشیا کے مشرقی ساحل پر لنگر انداز ہوا جبکہ حقیقتاً وہ شمالی امریکا کے جزائر بہاماس (غرب الہند) میں آ نکلا تھا۔ اس کی لاعلمی اور خوش بختی بیک وقت رنگ لائی اور وہ شمالی امریکا کی وسعتوں کو ملکہ ازابیلا کی ہسپانوی شاہی حکومت سے منسوب کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مشرقی ایشیا پہنچنے کے لیے مغرب کی سمت میں سفر نے اس کے قیافے کے عکس اسے قبلائی خان کے چین یا سی پانگو (جاپان) کی بجائے شمالی امریکا میں جزائر غرب الہند میں (جہاں پاکستانی ٹیم کے کوچ کی پُراسرار موت،

اس کے ورثا کی معنی خیز خاموشی کے بعد پاک ٹیم کے مذہب سے لگاؤ کو ہدف تنقید بنائے جانے کی خبریں گرم ہیں) پہنچادیا تھا۔ کیوبا، بہاماس اور جمیکا کو وہ قبلائی خان کی سلطنت کے علاقے سمجھتا رہا اور اپنے عمر کے آخری حصے تک وہ اسی مغالطے میں مبتلا رہا۔ کولمبس جزائر غرب الہند میں ''گوانا ہانی'' جزیرے پر لنگر انداز ہوا جو کہ آج کل ڈومنیکن ری پبلک اور ہیٹی پر مشتمل ہے۔ گوانا ہانی میں ساحل پر قدم رکھتے ہی کولمبس کو جو چیز سب سے پہلے نظر آئی وہ وہاں کے مقامی باشندے آراواک قبائل کے امریکن انڈین تھے جو ریڈ انڈین کہلائے گئے۔ گوانا ہانی اور اس کے قرب وجوار کے جزائر اب سان سالویڈور کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اراواک قبائل کے ان ریڈ انڈینز کا رویہ دوستانہ اور طور طریقے شائستہ تھے۔ کولمبس نے اس امر کے باوجود کہ ان جزیروں میں پہلے سے ہی ہزاروں لوگ آباد ہیں اور وہ اپنے قاعدے قانون، رسم ورواج، مذہب اور ثقافت کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں، ان جزیروں پر اسپین کی شاہی حکومت کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔ اس علاقے کو ہسپانوی نام ''سان سالویڈور'' سے منسوب کیا اور مقامی آبادی کو اپنے قیافے کے مطابق ''انڈینز'' کہا گیا۔ مقامی لوگوں سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں کولمبس نے اپنے روزنامچے میں لکھا:

''وہ ہمارے لیے رنگ برنگ پرندے، روئی کے گٹھے، کمانیں اور دوسری اشیا لے کر آئے اور ہم سے بدلے میں بیلوں کی گردن میں ڈالنے والی گھنٹیاں اور شیشے کی لڑیاں لے گئے۔ یہ لوگ اشیا کے بدلے اشیا پر ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کے جسم مضبوط اور صحت مند ہیں۔ یہ لوگ سادہ، جفاکش اور بے ضرر نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ تو ہتھیاروں کے استعمال کا علم ہے نہ ہی یہ کسی ہتھیار سے مسلح ہوتے ہیں۔ جب میں نے اپنی تلوار ان لوگوں کو دکھائی تو بیشتر نے اپنی اُنگلیوں اور ہاتھوں کو تیز دھار تلوار سے زخمی کرلیا۔ یہاں پر ابھی تک لوہے کا استعمال شروع نہیں ہوا ہے۔ ان کے تیر کمان لکڑی، گنا اور بانس

سے بنے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لوگ بہترین خدمت گار اور اچھے غلام ثابت ہوں گے۔ ہم صرف پچاس لوگوں کی مدد سے تمام مقامی آبادی پر غلبہ حاصل کر کے انہیں بآسانی غلام بنا سکتے ہیں۔''

اس مختصر سی تحریر نے آنے والی پانچ صدیوں کو جتنا متاثر کیا اور انسانی لہو کا جس قدر خراج لیا، تاریخ عالم میں شاید ہی کوئی اور تحریر اتنے بڑے پیانے پر قتل و غارت گری کی بنا بنی ہو۔ بہترین خدمت گاروں اور اچھے غلاموں کے حصول کی سفلی خواہش نے زور باندھا اور جدید اسلحہ کی مدد سے سادہ لوح کمزور انسانوں پر غلبہ حاصل کر لینے کے یقین نے کولمبس اور اس کے سر پرستوں کو ملکوں ملکوں پھرنے اور لوٹ کے مال سے ہوس زر کو تسکین دینے پر آمادہ کیا۔ یہ انسانیت سوز روش آج تک جاری ہے اور امرِ الٰہی نازل ہونے تک جاری رہے گی۔ مظلومانِ عالم سراپا انتظار ہیں کہ یہ امر کب اور کس کے ہاتھوں پورا ہوگا؟؟؟

15 مارچ 1493ء کو کولمبس جب واپس اسپین پہنچا تو کایا پلٹ چکی تھی۔ وہ سرخ رُو اور کامران لوٹا تھا۔ جس اُمید اور وعدے پر ملکہ ازابیلا نے کولمبس کی سر پرستی کی اور اس کی بحری مہم میں سرمایہ کاری کی تھی وہ پورا ہوا۔ واپسی پر کولمبس کے رخت سفر میں سونے کی ڈلیاں، چاندی کے ڈلے، سفوف کی شکل میں کچھ سونا، مکئی، تمباکو اور شمالی امریکا میں پائے جانے والے پرندوں کے علاوہ وہ دس بدنصیب ریڈ انڈین بھی شامل تھے جنہیں ملکہ کو دکھانے کی غرض سے وہ اغوا کر لایا تھا۔ بحری مہم سے واپسی پر کولمبس کا رائل ایڈمرل کے طور پر استقبال ہوا اور اسے عزت و تکریم کے ساتھ بارسلونا کے شاہی محل میں ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈی نینڈ کے مہمان کے طور پر ٹھہرایا گیا۔ وہی کولمبس جو معاہدے کی بات چیت کے دوران تمام وقت ملکہ ازابیلا کے سامنے دست بستہ کھڑا رہا تھا اب ملکہ اور بادشاہ کے درمیان بیٹھا روسٹ کی ہوئی رانیں اُڑا رہا تھا۔ طرح طرح کی شرابیں اس کے سامنے رکھی تھیں اور

خوبرو خادمائیں اس کی جنبش ابرو کی منتظر تھیں۔ کولمبس دریافت کردہ نئی دنیا کے بارے میں اپنے تجربات، معلومات، سفر کی صعوبتوں اور آیندہ منصوبوں کے بیان سے سماں باندھے ہوئے تھا۔ اس موقع پر کولمبس نے ایک تحریری رپورٹ ملکہ ازابیلا کو پیش کی جسے وائسرائے کی طرف سے شاہی حکومت کی خدمت میں پیش کردہ سرکاری دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس رپورٹ میں کولمبس نے لکھا: ''ریڈ انڈینز اپنے دفاع کے قابل نہیں ہیں۔ ان کے رسم ورواج میں ذاتی ملکیت کا تصور ناپید ہے۔ یہ لوگ سادہ اور بے ضرر ہیں۔ ان کو دیکھے بغیر ان کی سادگی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ ان سے جب بھی کچھ طلب کیا جائے تو وہ دینے سے انکار نہیں کرسکتے۔ زمین اور وسائل کسی کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ مشترکہ استعمال اور اجتماعی ملکیت کا قانون رائج ہے جبکہ استعمال کرنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ موت اور نقل مکانی کی صورت میں نئے استعمال کرنے والے آجاتے ہیں لیکن متعلقہ لواحقین کسی اثاثے پر خاندانی ملکیت کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اگر ملکہ اور بادشاہ میری مدد کریں تو میں ان کے لیے اس نئی دریافت کردہ دنیا سے اتنا سونا لاسکتا ہوں کہ جو ضرورت سے سوا ہو اور اتنے غلام لادوں گا کہ جتنے کا حکم دیا جائے گا۔''

امریکا کے تہذیب یافتہ بانیوں اور انسانیت کی کامیابی کے لیے عیسائیت پھیلانے والوں کی نیتوں کا یہ حال تھا۔ جس کی نیت ظلم، انسانی حقوق وحرمت کی پامالی اور حرص وہوس سے آلودہ تھی، آج وہی شخصیت امریکی ہیرو ہے۔ جو شخص سادہ، بے ضرر اور ناقابل دفاع لوگوں کو غلام بنانے کے منصوبے باندھتا رہتا تھا اور ان کی زمینیں ہتھیانے اور آزادی سلب کرلینے کی چالیں سوچتا رہتا تھا، آج امریکا بھر میں اس کی یادگاری مجسمے ایستادہ اور ستائشی کتبے آویزاں ہیں۔ امریکا کے طول وعرض میں کولمبس کی یاد اور اظہارِ تشکر میں اس کے 105 مجسمے، 140 ستائشی کتبے اور 20 تعویذی سلیں آویزاں ہیں۔ کولمبس کے یادگاری مجسموں کا

یہ سلسلہ اسپین سے شروع ہوا اور اٹلی، جزائر غرب الہند، لاطینی امریکا، یورپ اور شمالی امریکا تک پھیل گیا۔ اب ان ممالک میں کولمبس کے قریب پانچ صد مجسمے گڑے ہیں اور دو ہزار سے زیادہ دوسری یادگاریں کولمبس کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اس سے امریکی قوم کی حریص سرشت اور ہوس ناک فطرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

امریکا میں کولمبس کے مجسموں کے علاوہ ملکہ ازابیلا کے مجسمے بھی ایستادہ ہیں۔ لاکھوں مسلمانوں اور ریڈ انڈینز کا خون ناحق ازابیلا کی گردن پر ہونے کے باوجود اسے امریکی دریافت کا اسپانسر ہونے کی وجہ سے امریکی تاریخ میں امتیاز حاصل ہے۔ ملکہ کا امتیاز مالی معاون ہونے کی وجہ سے خصوصی سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اسی مالیاتی ناطے سے ملکہ ازابیلا کا ایک عظیم الشان مجسمہ واشنگٹن ڈی سی میں امریکی مالیات کے سب سے بڑے ادارے ''فیڈرل ریزرو بورڈ'' کے پہلو میں گڑا ہے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

کولمبس کی دلائی گئی ترغیب، تحریص اور پیش کش سے ملکہ اور بادشاہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ سو کولمبس کو دریافت کردہ نئی دنیا کے دوسرے سفر پر جانے کے لیے ضروری وسائل اور پروانہ جاری کر دیا گیا۔ 25 ستمبر 1493ء کو جب کولمبس شمالی امریکا کی طرف اپنے دوسرے سفر پر روانہ ہوا تو یہ اس کی زندگی کا یادگار لمحہ اور نکتۂ عروج تھا۔ بحیثیت رائل ایڈمرل اس کی کمان میں 17 جہاز دے دیے گئے جن میں بارہ سو افراد بھرے ہوئے تھے۔ اس سفر کا واضح مقصد تسخیر، آبادکاری، غلبہ اور نئی دنیا میں ہسپانوی کالونی کا آغاز کرنا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے بارہ سو افراد میں سے بیشتر جہاں دیدہ جنگجو، ماہر تلوار باز اور تجربہ کار تیر انداز تھے۔ جنگجوؤں کے علاوہ جہازوں میں گھوڑے، مال مویشی، بکریاں، کتے، سور، مرغیاں، اناج، بیج، عمارتی سامان اور اسلحہ بھرا ہوا تھا۔

چار ہفتوں کے سفر کے بعد کولمبس جب دوبارہ جزائر غرب الہند میں اسی جگہ پہنچا جہاں وہ پہلے آ چکا تھا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اب وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ مقامی آبادی کولمبس کے آدمیوں کے ہاتھوں جنہیں وہ آبادکاری کی غرض سے پیچھے چھوڑ گیا تھا، ماری جا چکی تھی یا نقل مکانی کر چکی تھی۔ کولمبس نے اسی جگہ کے قریب نسبتاً محفوظ جگہ پر پہلی ہسپانوی کالونی کی داغ بیل ڈالی اور اس شہر کا نام ''ازابیلا'' رکھا گیا۔ آبادکاروں کو ازابیلا میں کالونی قائم کرنے پر لگا کر وہ خود سونے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن اس میں اسے ناکامی ہوئی اور سونے کی وہ کثیر مقدار اس کے ہاتھ نہ لگ سکی جس کا وعدہ وہ اسپین کے حکمرانوں سے کر چکا تھا۔ سونے کے حصول میں ناکامی کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے اس نے جبری مشقت کے لیے مقامی لوگوں کو غلام بنا کر اسپین لے جانے کا فیصلہ کیا۔ کولمبس کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ مضبوط کاٹھ کے صحت مند ریڈ انڈینز اسپین میں اچھی قیمت پر بکیں گے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں گے۔ اس طرح سونے کی بجائے متبادل ذریعہ آمدنی اسے ملکہ اور بادشاہ کے عتاب سے محفوظ رکھے گا۔

کولمبس کے اس فیصلے نے ریڈ انڈینز کی قسمت پر موت، مصائب، لاچارگی، تباہی و بربادی اور نسل کشی کی ایک ایسی سرخ لکیر کھینچ دی جو پانچ سو سال گزر جانے کے بعد بھی اپنی ہولناکی کے ساتھ قائم ہے۔ امریکا کے قیام کی خشتِ اول ہی ناانصافی، جبر، ظلم اور ناحق انسانی خون پر رکھی گئی۔ انسانی تذلیل اور انسانی حقوق کی پامالی کے جو مناظر امریکی سرزمین میں رونما ہوئے، چشم فلک نے ایسے انسانی المیے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ ملکہ ازابیلا کا عیسائیت پھیلانے کا جنون، اس کے شوہر فرڈی نینڈ کی ہوس ملک گیری اور کولمبس کا طمع، پسماندہ، بے ضرر اور دنیا سے قطع تعلق ریڈ انڈینز پر ایک ایسی تباہی لے آیا کہ انسانی تاریخ میں ایسی خون آشامی، ایسی بربادی اور ایسی نسل کشی کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ مشہور مورخ

ہاورڈ زین لکھتے ہیں:

''بہاماس کے ساحل پر جب کولمبس کا جہاز لنگر انداز ہوا تو اس ساحلی علاقے میں تیانو اور آراواک قبیلے آباد تھے، جو ریڈ انڈینز کے بڑے قبیلوں میں شمار ہوتے تھے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان قبائل کے افراد ناپید ہوگئے۔ وہ پابہ زنجیر ہوئے اور غلام بنا کر اسپین کی طرف روانہ کردیے گئے یا قتل ہوگئے۔ ہسپانوی آبادکاروں کے ہاتھوں بہاماس اور ہیٹی کے جزائر میں ایک لاکھ سے زیادہ آراواک انڈینز تہ تیغ کیے گئے۔ کولمبس کے لشکری ایک کے بعد ایک جزیرے میں تلواریں لہراتے ہوئے جاتے، عورتوں کی آبروریزی، بچوں اور بوڑھوں کو قتل اور جوان مردوں کو زنجیریں پہنا کر کھینچتے ہوئے ساتھ لے جاتے۔ جو مزاحمت کرتا قتل ہوجاتا۔ چونکہ ہسپانوی حملہ آور لٹیروں کی قتل وغارت کی صلاحیت اور ریڈ انڈینز کی مدافعت کا آپس میں کوئی جوڑ، کوئی تناسب، کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔''

1494ء سے 1508ء تک کے درمیانی عرصے میں صرف جزائر غرب الہند میں 40 لاکھ سے زیادہ ریڈ انڈینز قتل کیے گئے۔ کولمبس کے ہمراہ جانے والے عیسائی مبلغ لاس کیسس...... جو اس کا روزنامچہ نگار بھی تھا...... نے ایسے کئی دہشت ناک واقعات کا ذکر کیا ہے جن سے اس ظلم وجور کا اندازہ ہوتا ہے جو ریڈ انڈینز پر روا رکھا گیا۔ لاس کیسس لکھتا ہے: ''ہسپانوی آبادکاروں نے ریڈ انڈینز کی اجتماعی پھانسیوں کا طریق کار جاری کیا جبکہ بچوں کو قتل کرکے ان کی لاشوں کو کتوں کے سامنے بطورِ خوراک پھینک دیا جاتا۔ نوجوان عورتوں کی اکثریت اس وقت تک جنسی تشدد کا شکار ہوتی رہتی جب تک مر نہ جاتی۔ ملکیت سے بے نیاز، ان لوگوں کی معمولی قدر و قیمت کی اشیا تک لوٹ لی جاتیں۔ گھروں کو آگ لگادی جاتی اور ریوڑ کی صورت بھاگتے ہوئے غیر مسلح اور ناقابلِ دفاع لوگوں کا تیز رفتار گھوڑوں سے تعاقب کیا جاتا اور انہیں تیراندازی کی مشق کے لیے استعمال کیا جاتا۔ چند ہی

گھنٹوں میں شہر کا شہر زندگی سے عاری ہو جاتا اور آبادی نابود ہو جاتی۔ یوں ہسپانوی آبادکار، ریڈ انڈینز کی وسیع زمینوں پر غلبہ حاصل کرتے چلے گئے۔''

یہ امریکا کے قیام، پھیلاؤ اور فروغ کی ابتدا تھی۔ یورپی آبادکاروں اور بعد میں امریکی حکومت کے ہاتھوں جو ظلم بے ضرر، ریڈ انڈینز پر ہوا، انسانی تاریخ اس پر ہمیشہ شرمسار رہے گی۔ کولمبس نے جو سلوک جزائر غرب الہند میں آراواک اور تیانو قبائل سے روا رکھا۔ ایک دوسرے ہسپانوی حملہ آور کورٹیز نے وہی سلوک میکسیکو میں آزٹک تہذیب سے، پزارو نامی ایک اور ہسپانوی استعمار پسند نے پیرو میں انکس قبائل سے اور برطانوی آبادکاروں نے ورجینیا اور میساچوسٹس میں ریڈ انڈینز کے دوسرے بڑے قبیلے پوٹاہانز سے کیا۔ نتیجتاً شمالی اور جنوبی امریکا میں کروڑوں بے گناہ مقامی لوگ یورپی اقوام کی طمع، ہوس، سرمایہ داری، ہوس ملکیت، قبضہ زمین، سونے کے حصول اور ہوس ملک گیری کا شکار ہوئے۔ امریکی تاریخ کا صفحہ دہشت گردی، انسانی لہو اور ہوس وحیوانیت سے آلودہ ہے۔

اس تاریخی صداقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ موجودہ امریکا کی اساس مذہبی انتہا پسند فرڈی نینڈ کی جنونیت، غیر متوازن شخصیت کی مالکہ ملکہ ازابیلا کی خون آشامی، کولمبس کے افعال ناپسندیدہ، ریڈ انڈینز کے خون ناحق اور ان سے بزورِ طاقت چھینی گئی زمینوں پر رکھی گئی ہے۔ جمہوریت، برابری، آزادی، انصاف اور انسانی حقوق کی جو اقدار آج امریکا کا امتیاز قرار پائیں، ریڈ انڈینز اور کالے امریکیوں کو 1965ء تک ان سے محروم رکھا گیا ہے۔ ملکوں ملکوں جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کا تمغہ دینے والے امریکا میں انسانی حقوق اور آزادی روئے زمین پر سب سے زیادہ پامال ہوئی ہے۔ اقوامِ عالم کی تاریخ میں انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزی یہیں ہوئی اور انسانی آزادی پر سب سے بڑا ڈاکہ بھی یہیں پڑا۔ امریکی زمین کی زرخیزی میں سوملین ریڈ انڈینز کے خون ناحق کے ساتھ ساتھ

امریکی معیشت کی آبیاری میں پندرہ ملین افریقی غلاموں کی بددعائیں بھی شامل ہیں۔ کیا عجب کہ شاید اسی وجہ سے نہ کسی کو امریکی جمہوریت راس آتی ہے کہ یہ قتل آمادہ اور قہر زدہ ہے نہ امریکی امداد و اسباب کہ یہ نحوست زدہ اور بددعا یافتہ ہیں۔

ملکہ ازابیلا اور کولمبس کے اندر چھپا حریص عفریت، غلبے اور منفعت کی تلاش میں ملکوں ملکوں لہو چاٹتا ہوا، افغانستان کے چٹیل پہاڑوں اور عراق کے صحراؤں تک آن پہنچا ہے اور ادھر کے مکین بھی اگر لکڑی کے تیر اور بانس کی کمانوں سے مزاحم نہیں تو اس سے کچھ زیادہ کے بھی متحمل نہیں۔ کولمبس کا لاطینی امریکا میں غلبہ ایک ایسے نظریاتی غلبے کی بنیاد ثابت ہوا جو پورا ہونے میں ہی نہیں آتا۔ ملکہ ازابیلا نے امریکا میں زبردستی کا جو بیج بویا تھا اس کی بنیاد مذہبی تنگ نظری، پاپائیت، جبر اور دھاندلی پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نظریے کی عمر طویل تر، اس کا اطلاق اکثر و بیشتر اور اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

سولہویں اور سترہویں صدی میں ریڈ انڈینز اس کا سب سے پہلا شکار بنے اور انسانی تاریخ کی بدترین نسل کشی کا شکار ہوئے۔ ان کی وجہ قتل ان کا ''غیر مہذب'' ہونا قرار دی گئی۔ اٹھارہویں صدی میں براعظم افریقہ کے لوگ اس کی زد میں آئے۔ انہیں غلام بنانے کی وجہ ان کی ''جانوریت'' قرار دی گئی۔

انیسویں صدی سے یہ عفریت چہار سمت اور بے مہار ہوا اور ارجنٹائن، چلی، چین، کوریا، پانامہ، نکاراگوا، فلپائن، کیوبا اور میکسیکو اس کے خونی جبڑوں میں جکڑے گئے۔

بیسویں صدی میں یوگوسلاویہ، ہنڈورس، لاؤس، کمبوڈیا، ویت نام، لبنان، گرینیڈا، لیبیا، ایران، عراق، کوریا، صومالیہ، ہیٹی، سوڈان اور وسطی امریکا کے علاقے اس کا شکار بنے۔

اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی افغانستان اور عراق اس کی خونی گرفت میں ہیں۔ قرائن کہتے ہیں کہ اس صدی میں مسلم اُمہ اس کا سب سے بڑا شکار ہوگی اور شواہد کی رُو سے دہشت گردی کی آخری جنگ، آخری معرکہ پاکستان میں ہوگا۔ سو، اے اہل وطن! چمن کی خیر مناؤ کہ جس کے سبب بیمار ہوئے اس سے دوا لینے کی سادگی کتنے دنوں تک عاشقی کا بھرم رکھے گی؟؟

ہسپانیہ

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی؟
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں!

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں!

غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے، ولیکن
تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں!

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں، نہ خبر میں!

طارق کی دُعا

(اندلس کے میدانِ جنگ میں)

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم اِن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سِمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دِل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی!

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے!

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں!

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں!

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اُس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں!

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ 'لَاتَذَرْ' میں!

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

مسلمانوں کی دو بڑی سلطنتیں سلطنت عثمانیہ اور سلطنت ہسپانیہ کی وسیع و عریض حدود۔ سلطنت عثمانیہ تین براعظموں ایشیا، افریقا اور یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور آج کا متحدہ یورپ اسے خراج ادا کرتا تھا۔

مسجدوں کے شہر استنبول کا خوبصورت نظارہ۔ یورپ کے دروازے پر واقع یہ اہم شہر فتح قسطنطنیہ کے یادگار واقعہ کے بعد عرصہ دراز تک خلافتِ عثمانیہ کا مرکز رہا۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ قربِ قیامت میں خروج دجال سے قبل یہاں ایک اہم واقعہ ہوگا اس کے فوراً بعد دجال ظاہر ہوگا۔

استنبول کی دو یادگار اور خوبصورت مسجدیں۔ پیچھے آبنائے باسفورس کا نیلگوں پانی جھلملا رہا ہے۔ عثمانی فاتحین اس شہر کو پایۂ تخت بنانے کے بعد پورا یورپ فتح کرنا چاہتے تھے مگر تیمور لنگ اور سلطان بایزید یلدرم کی باہمی جنگ نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

ایشیا کو یورپ سے ملانے والا تاریخی پل۔ ایک جانب میں وہ مضبوط و مستحکم قلعہ نظر آ رہا ہے جسے فتح کرنے کی کوششیں بہت سے مسلم سپہ سالاروں نے کیں لیکن کامیابی کا تاج بالآخر اکیس سالہ مسلم حکمراں سلطان محمد فاتح کے سر پہ سجا۔
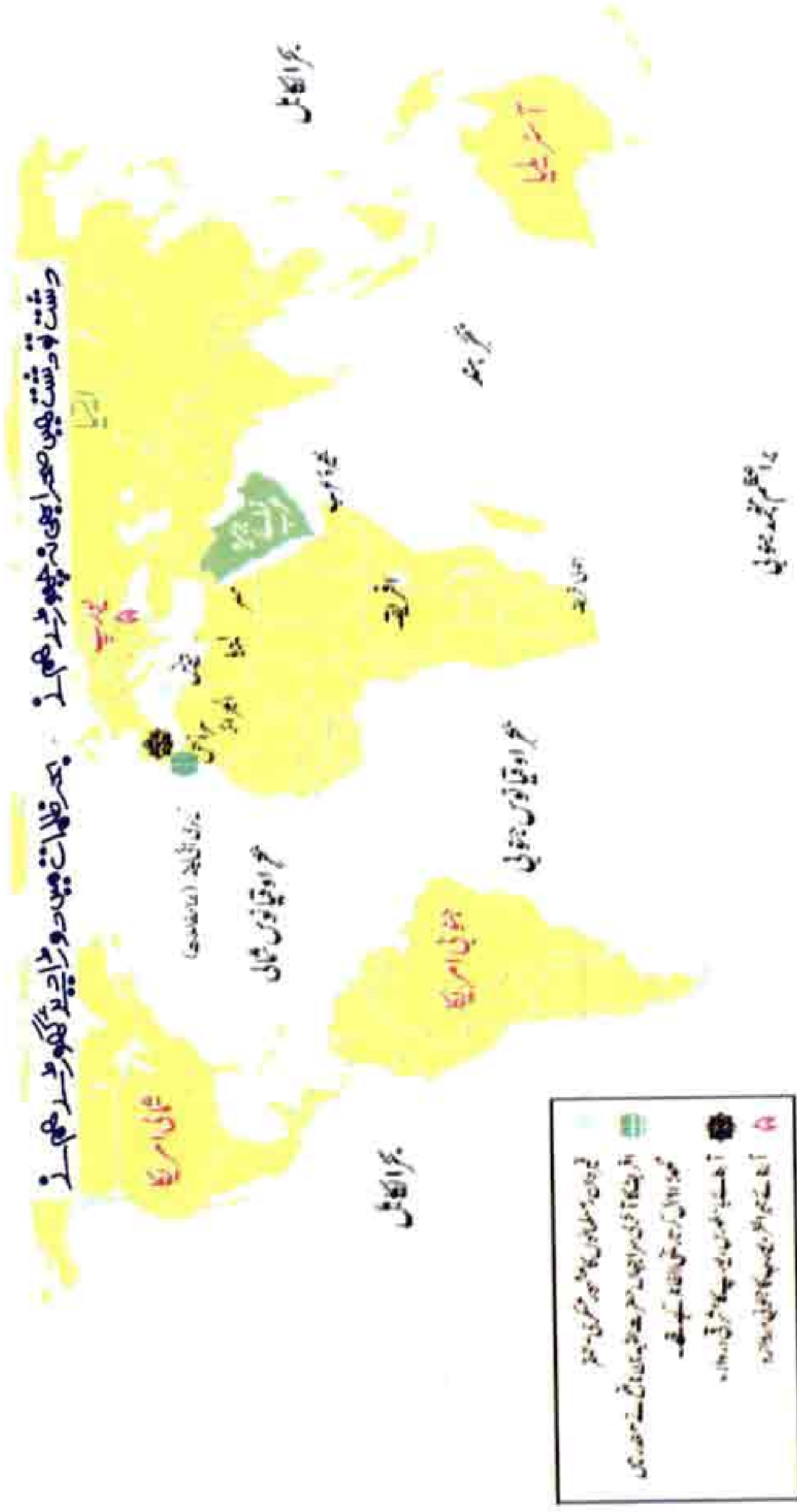
اس نقشے میں یورپ میں داخلے کے دو راستے دکھائے گئے ہیں۔ مشرقی راستے پر قسطنطنیہ واقع تھا اور جنوبی پر جبل الطارق (جبرالٹر) مسلمان دونوں کو عبور کر کے یورپ کے وسط تک پہنچ گئے لیکن فتح کا یہ سفر مکمل ہو کر دوسرے دروازے تک نہ پہنچ سکا۔ یہ نقشہ زبانِ حال سے مسلم نوجوانوں کو ایک تشنہ تاریخی خواہش کی تکمیل کی دعوت دے رہا ہے۔
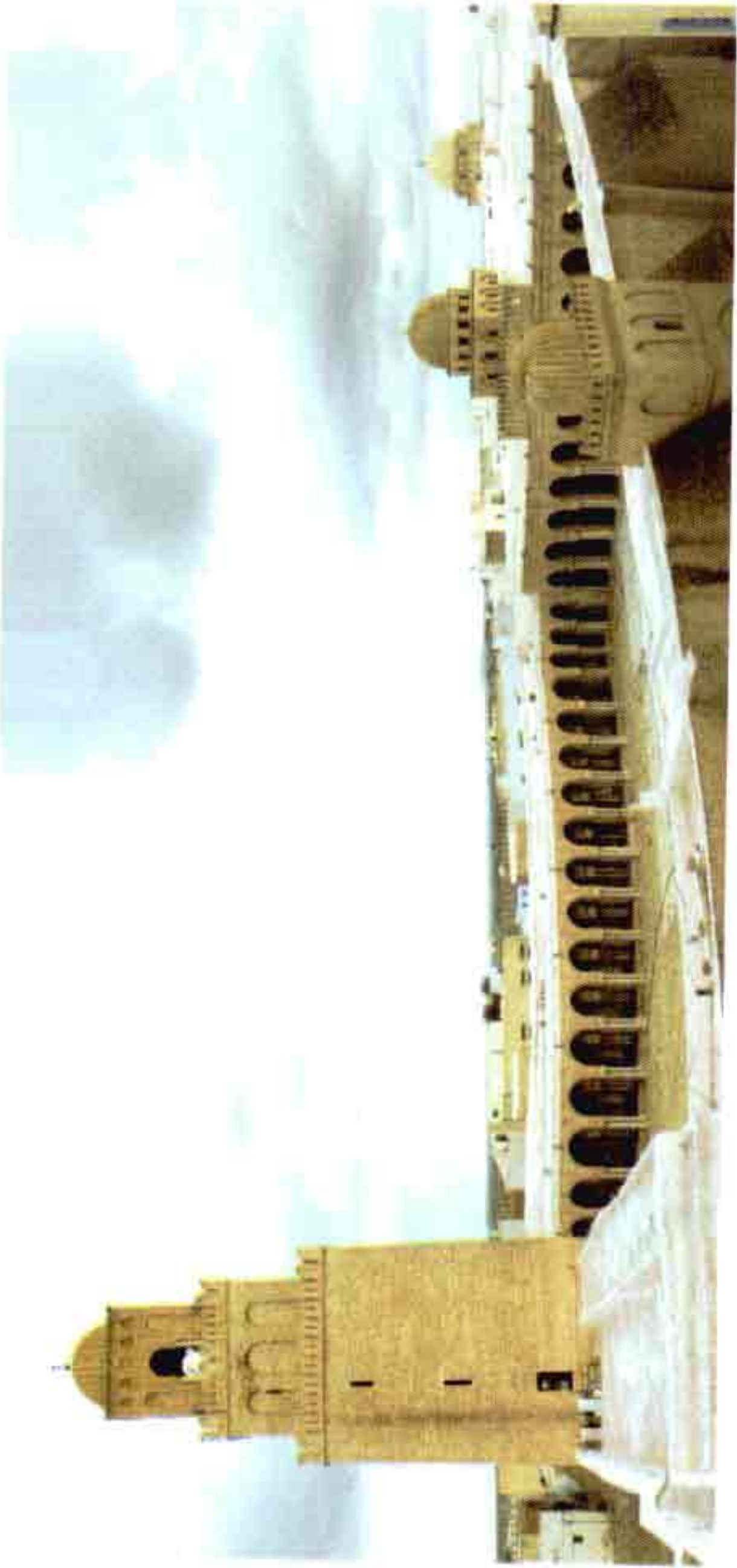
تیونس کے تاریخی شہر قیروان میں وہ تاریخی جامع مسجد جس کی بنیاد فاتح افریقا حضرت عقبہ بن نافع نے رکھی تھی۔ اس جگہ کو عرصہ دراز تک مسلمان مجاہدین کا عسکری مستقر ہونے کا شرف حاصل رہا۔
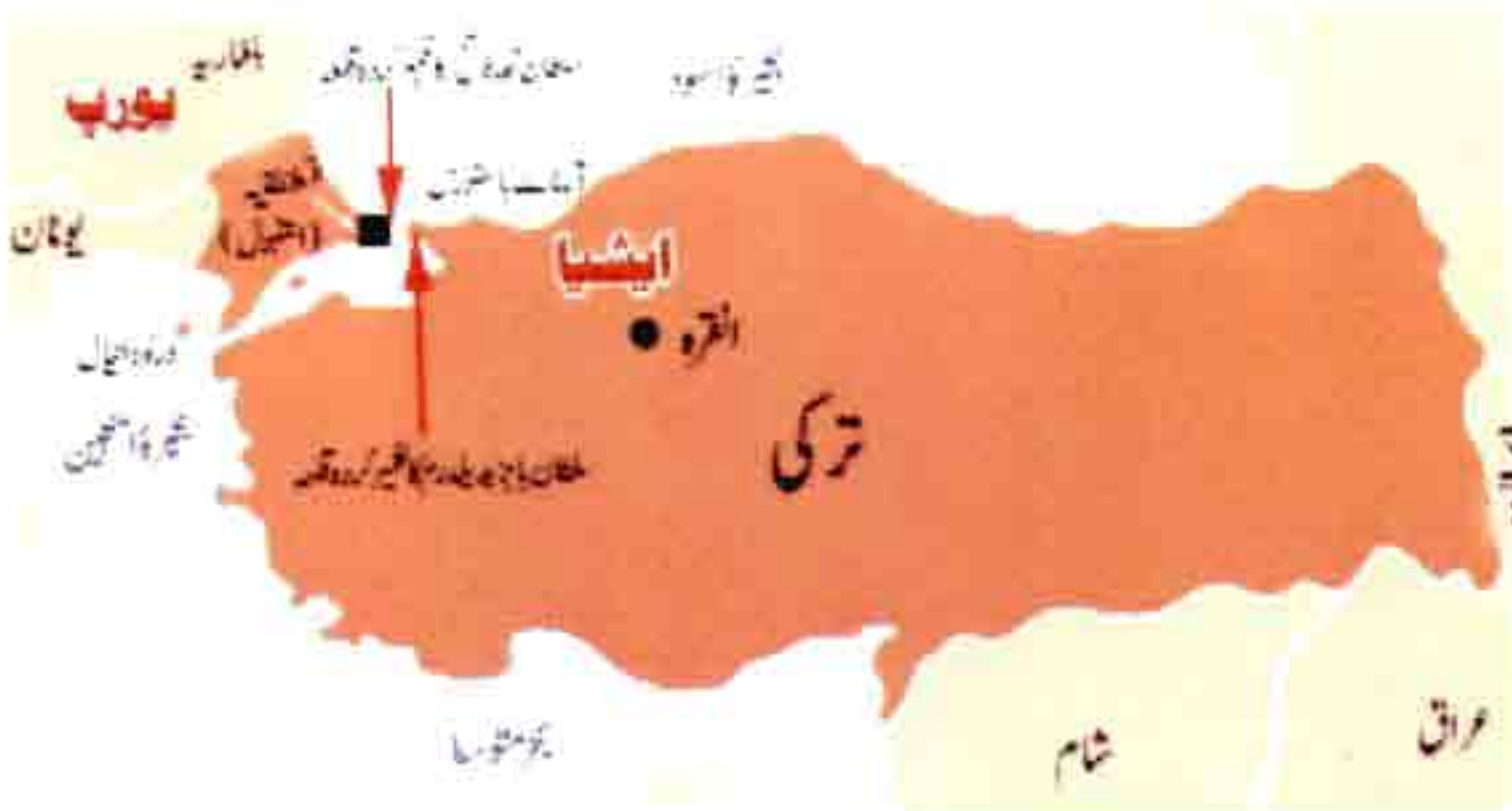
قسطنطنیہ یورپ کا دروازہ ہے۔ اس کی فتح کی بشارت حدیث نبوی میں دی گئی تھی جس کی بنا پر بہت سے مسلمان حکمران اور سپہ سالار اس سعادت کے حصول کی کوشش کرتے رہے بالآخر فتح کا تاج نوجوان مسلم حکمران سلطان محمد فاتح کے سر پر سجا جس نے ایک عجیب وغریب تدبیر سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اوپر کے دونوں نقشوں میں اس کے محیر العقول کارنامے کی خاکہ کشی کی گئی ہے۔

قسطنطنیہ کی شہرۂ آفاق فصیلوں کا اندرونی و بیرونی منظر۔ ان مضبوط اور مستحکم فصیلوں کو جن میں 170 فٹ کے فاصلے سے حفاظتی برج بنے ہوئے تھے اور پہلی اور دوسری دیوار کے درمیان خندقیں کھدی ہوئی تھیں، ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا مگر ایک مسلمان نوجوان سپہ سالار کے عزم و ہمت نے ان کو فتح کر دکھایا۔ آج کے مسلمان نوجوانوں میں بھی یقیناً اس طرح کی صلاحیتیں ہیں لیکن انہیں لہو ولعب میں اُلجھا دیا گیا ہے۔

جبل الطارق کا ایک خوبصورت نظارہ۔ اس جگہ کو اندلس کے مسلم فاتحین کی قدم بوسی کا شرف سب سے پہلے حاصل ہوا اور یہیں کسی جگہ طارق بن زیاد نے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی جس سے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا حوصلہ اتنا بلند ہوا کہ انہوں نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کے خلاف تاریخ عالم کی عظیم الشان فتح حاصل کی۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
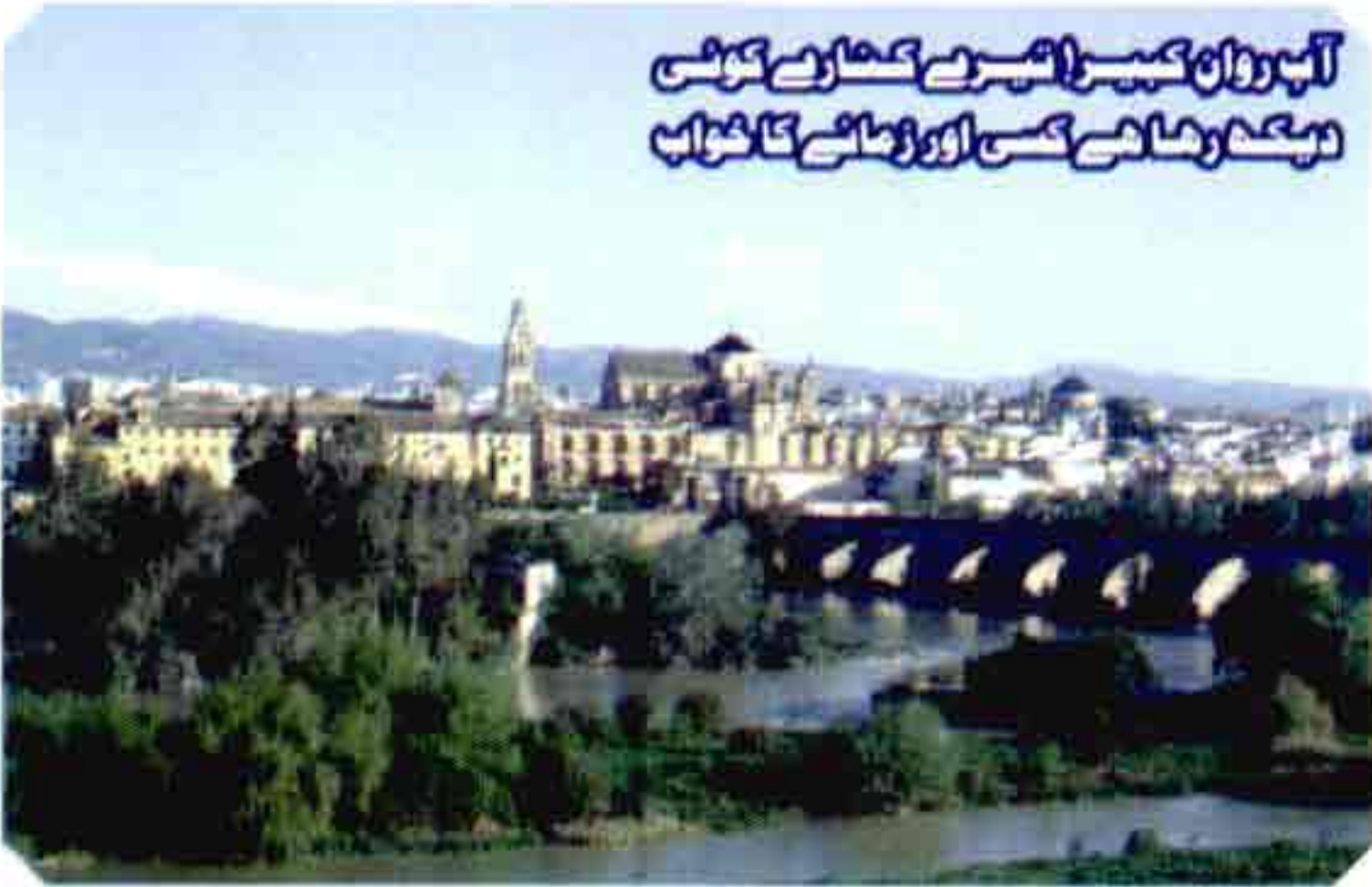
جامع قرطبہ کے قریب دریائے وادی الکبیر پر مسلمانوں کے تعمیر کردہ تاریخی پل کے دو حسین مناظر۔ پس منظر میں جامع قرطبہ کے مینار مسلمانوں کی عظمت کی داستان سنا رہے ہیں۔ یہ پُل حضرت عمر بن عبدالعزیز نے 101ھ میں ایک ماہر تعمیرات عبدالرحمن بن عبیداللہ الغافقی سے تعمیر کروایا تھا۔ اس کی لمبائی ساٹھ باتھ، چوڑائی چالیس گز اور دریا سے بلندی ساٹھ باتھ تھی۔ اس کے نیچے اٹھارہ خوبصورت در اور اوپر انیس برج بنائے گئے تھے۔ مشہور مورخ علامہ مقبری نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں اس پل کی کوئی نظیر نہیں تھی۔

جامع مسجد قرطبہ کا دل نواز نظارہ۔ دائرے میں وہ گرجا نظر آ رہا ہے جسے سقوطِ قرطبہ کے بعد عیسائی حکمرانوں نے مسجد کے بیچوں بیچ تعمیر کر کے اپنی بدذوقی کا مظاہرہ کیا۔ نیچے کی تصویر مسجد کے ہال کی ہے جس کے دلفریب نقش و نگار دیکھنے والوں کو آج بھی مبہوت کر دیتے ہیں۔

قرطبہ کی عالی شان مسجد جو مسلمانوں کی غیرت وحمیت کے لیے سراپا فریاد ہے۔ اس مسجد میں جانے رات کے وقت دو سو اسی فانوس روشن ہوتے تھے جن کے روشن پیالوں کی تعداد سات ہزار چار سو پچیس تھی۔ ہر جمعہ کو مسجد میں آدھا سیر عود اور پاؤ بھر عنبر جلایا جاتا تھا لیکن آج یہ مسجد دن کے وقت بھی تاریک ہوتی ہے۔

جامع مسجد قرطبہ کی بیرونی دیوار اور مینار۔ اس مرقع عبرت تصویر میں ایک طرف خوبصورت اور پائیدار تعمیرات مسلمانوں کی شوکت وعظمت کی داستان سنا رہی ہیں جبکہ دوسری طرف مینار میں لگی گھنٹیاں اور مسجد کی دیوار پر لگی صلیب دل چھلنی کیے دے رہی ہیں۔

جامع مسجد قرطبہ کا اندرونی منظر جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کے کمال فن اور جمال ذوق کا لازوال ثبوت ہونے کے ساتھ بزبان حال یہ پیغام دے رہے ہیں کہ کسی قوم میں جب بے عملی پھیل جائے تو وہ چاہے جتنے عروج پر ہو اسے زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسجد قرطبہ میں 1417 ستون تھے جو بوسیدگی کے باوجود آج بھی بڑے دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس مسجد کی چھت میں تین سو ساٹھ طاق اس ترتیب سے بنائے گئے تھے کہ سورج سال بھر کی گردش میں ہر روز ایک طاق سے داخل ہوتا تھا۔

جامع مسجد قرطبہ کے صحن میں پہلے مسلم خلیفہ عبدالرحمن الداخل کا لگایا گیا خوبصورت باغ جس میں کھجور اور مالٹے کے درخت خلیفہ نے خود اپنی نگرانی میں لگوائے تھے۔

مسجد قرطبہ کے قریب یہ مکانات مسلمانوں کی خوش ذوقی کے آئینہ دار تھے۔ پس منظر میں مسجد کا عظیم الشان مینار نظر آ رہا ہے۔

قرطبہ۔ مدینۃ الزہراء کا ایک حسین گوشہ مسلمانوں کو درسِ عبرت دے رہا ہے۔

قلت یوما لدار قوم تفانوا
أین سکانک العزاز علینا؟
فأجابت: ھنا أقاموا قلیلا
ثمّ ساروا، ولست أعلم أینا؟
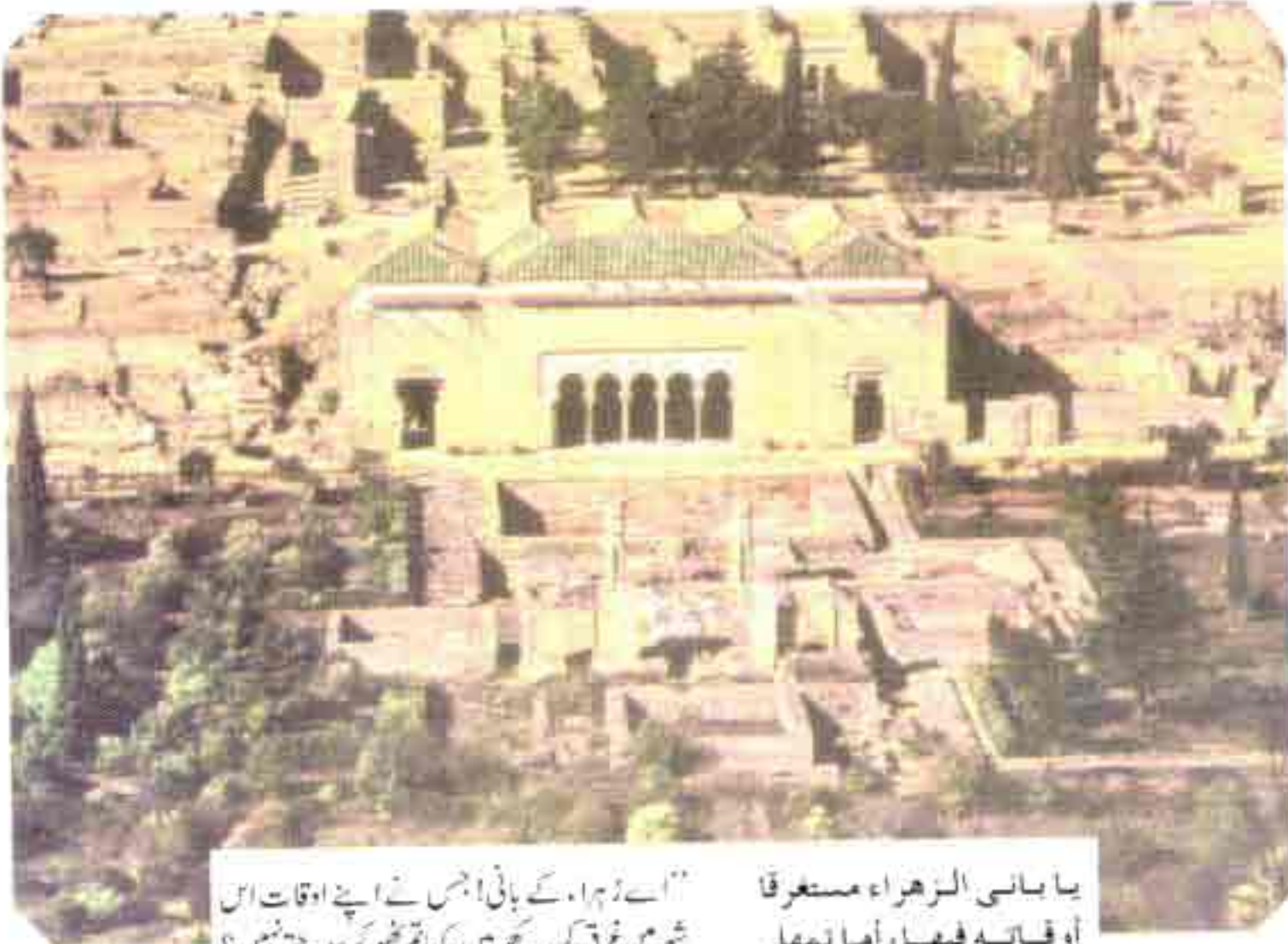
میں نے ایک دن ان لوگوں کے گھر سے کہا جو فنا ہو چکے تھے
تمہارے وہ مکین کہاں ہیں جو ہمیں بہت عزیز تھے؟
اس نے جواب دیا: وہ یہاں کچھ دیر کو ٹھہرے تھے
پھر چلے گئے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں؟

یا بانی الزھراء مستغرقا
أوقاتہ فیھا، أما تمھل
للہ ما أحسنھا رونقا
لولم تکن زھر تھا تذبل

''اے زہراء کے بانی! جس نے اپنے اوقات اس شہر میں غرق کر رکھے ہیں، کیا تم ٹھہر کر سوچتے نہیں؟ مدینۃ الزہراء کی رونق کتنی حسین ہے بشرطیکہ یہ پھول مرجھانے والا نہ ہوتا۔''

قرطبہ شہر سے آٹھ میل فاصلے پر واقع مدینۃ الزہراء کے کھنڈرات درس عبرت دے رہے ہیں۔ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کا بسایا ہوا یہ چھوٹا سا ''شاہی شہر'' اپنے حسن و جمال، شان و شوکت اور شکوہ و جلال کے اعتبار سے دنیا بھر میں اپنی مثال آپ تھا اور ایشیا و یورپ کے بڑے بڑے ملکوں کی سفارتیں بعض اوقات صرف اسے دیکھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔

سرسبز و شاداب درختوں میں گھرا ہوا قصر الحمرا جس کی مستحکم تعمیرات اور دلربا زیبائش و آرائش اندلس کے مسلمانوں کے بے مثال عروج کی یاد دلا رہی ہے۔
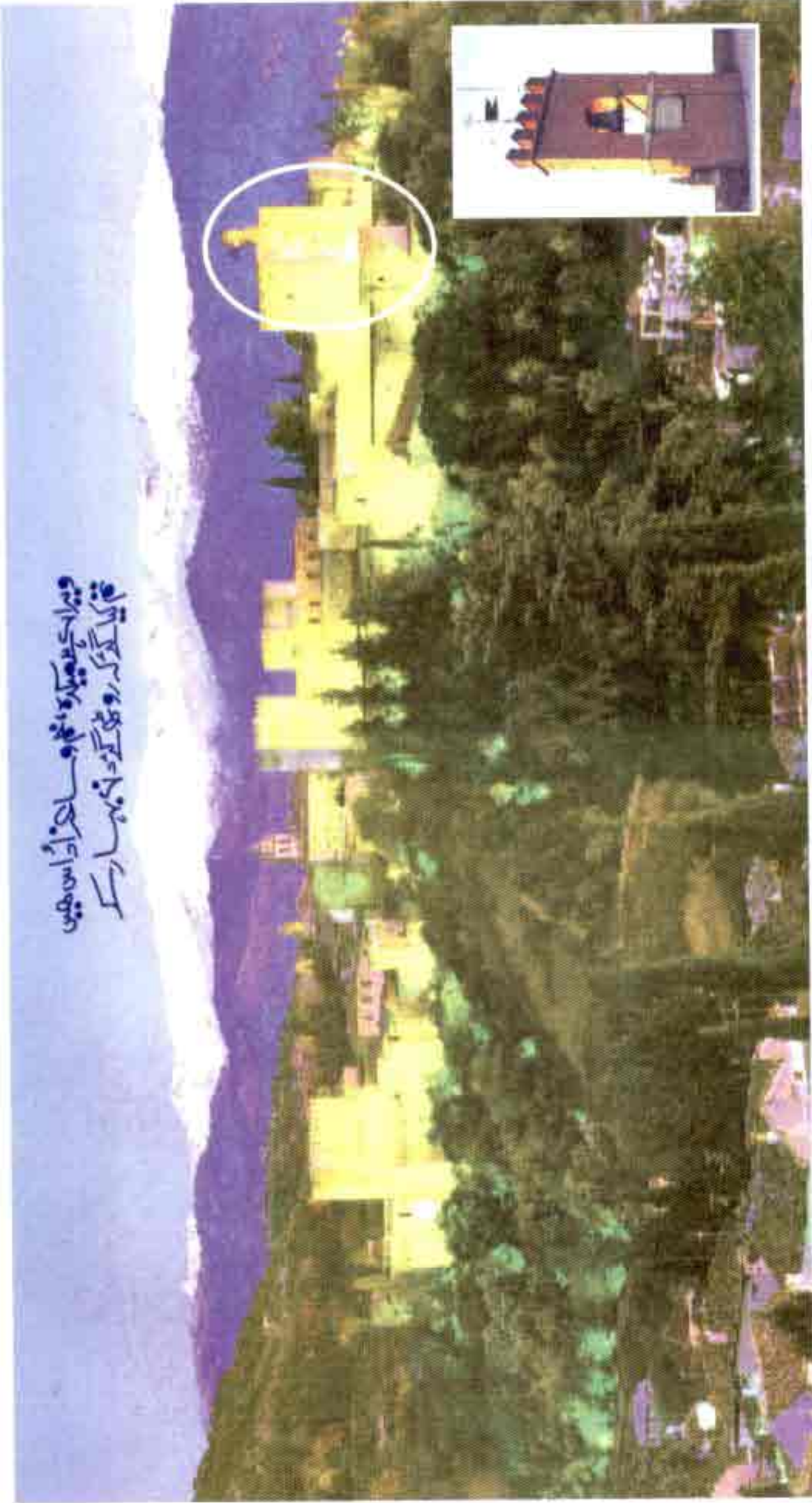
قصر الحمرا رات کے وقت اپنے سحر انگیز حسن کا طلسم بکھیر رہا ہے۔ دائرے میں وہ مشہور برج ہے جس پر 800 سال تک اسلامی پرچم لہراتا رہا لیکن مسلمانوں کی بداعمالیوں کے سبب آج یہاں صلیب نصب ہے۔
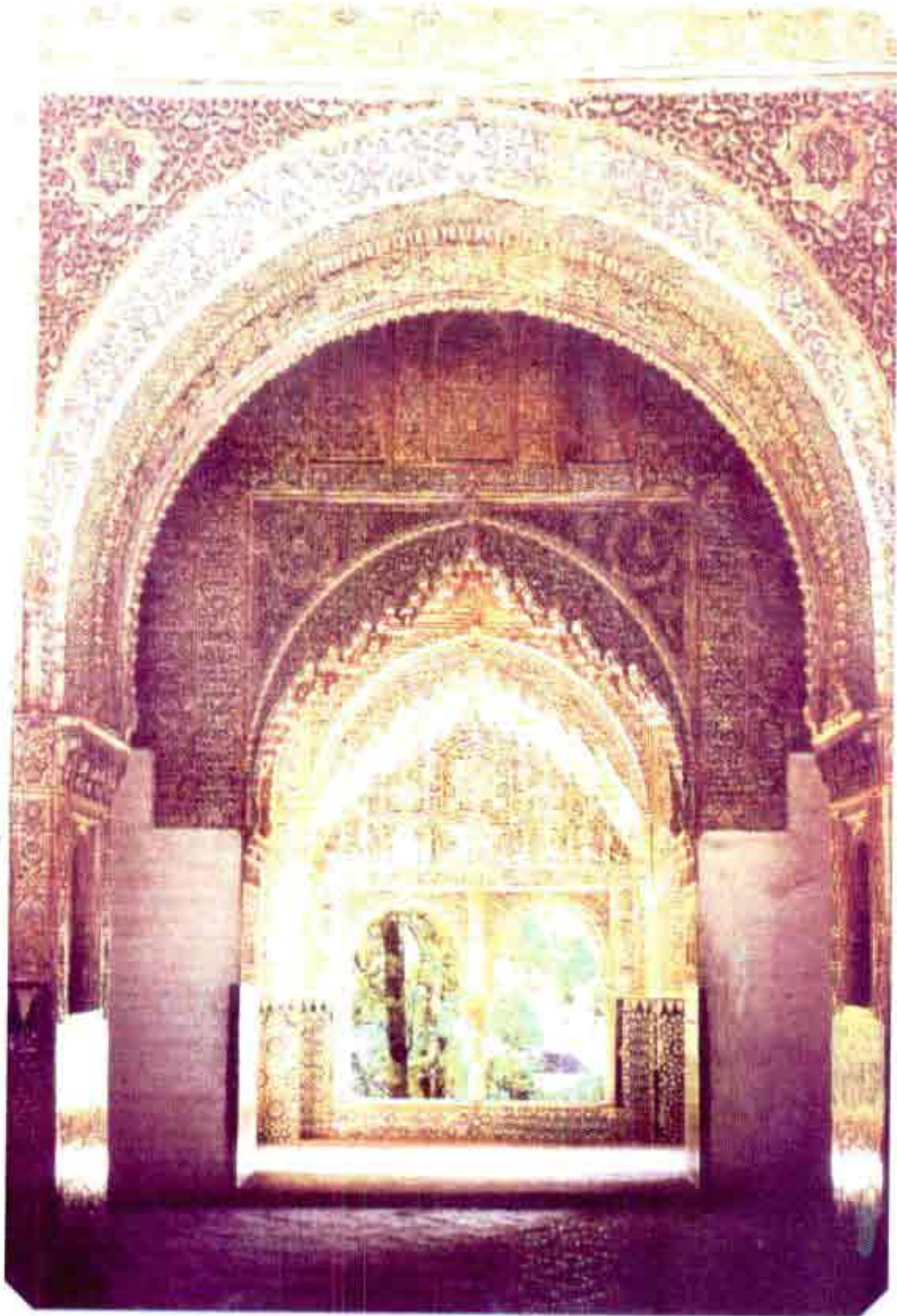
قاعۃ السفراء، یہاں مسلمانوں کا بادشاہ غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ عمارت میں قیمتی اور حسین ترین سنگ مرمر سے اتنی نفیس مینا کاری کی گئی ہے۔ آج کے دور میں بھی پتھر کو اس طرح موم بنانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

الحمرا کے شاہی محل کا خوبصورت ترین حصہ "مربعِ الاسود"۔ خوشنما محرابوں والے صحن کے بیچ میں ایک حوض شیروں کی پشت پر دھرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیروں کی آنکھیں، ناک اور چہرے کے نقوش جان بوجھ کر نہیں بنائے گئے تاکہ بت کی شکل نہ بن جائے۔ ان شیروں کے منہ سے فواروں کی شکل میں پانی ابلتا رہتا ہے۔

الحمرا کے مکین اس طرح کے جھروکوں سے نیچے موجود حسین سبزہ زاروں کا نظارہ کیا کرتے تھے۔

الحمرا کے شاہی محلات کے دو خوبصورت حصے۔ جو سقوط غرناطہ سے چند ماہ قبل تک شعر و شاعری کی مجلسوں اور بے فکروں کی جھمکوں سے پوری طرح آباد تھے۔

قصر الحمرا میں موجود شاہی تفریح گاہ ''جنۃ العریف''۔ یہاں انواع و اقسام کے درختوں، رنگا رنگ پودوں اور پانی کے خوبصورت فواروں کی بہتات تھی۔ مسلمانوں نے اپنی حس جمالیات کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے اسے جنت نظیر بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

غرناطہ کے مسلمان رؤساء کی چھوڑی ہوئی حویلی کا خوبصورت حویلیاں جو مسلمانوں کے اعلیٰ ذوق کی یاددلاتی ہے۔ ان حسین مکانوں کے وارث مراکش میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے آبائی مکانوں کی کنجیاں اور تفصیلات محفوظ کر رکھی ہیں اور پانچ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی انہوں نے اپنے آبائی ورثہ کو فراموش نہیں کیا۔ دیکھیے! اپنی میراث واپس لینے کی ان کی یہ خواہش کب اور کیسے پوری ہوتی ہے؟
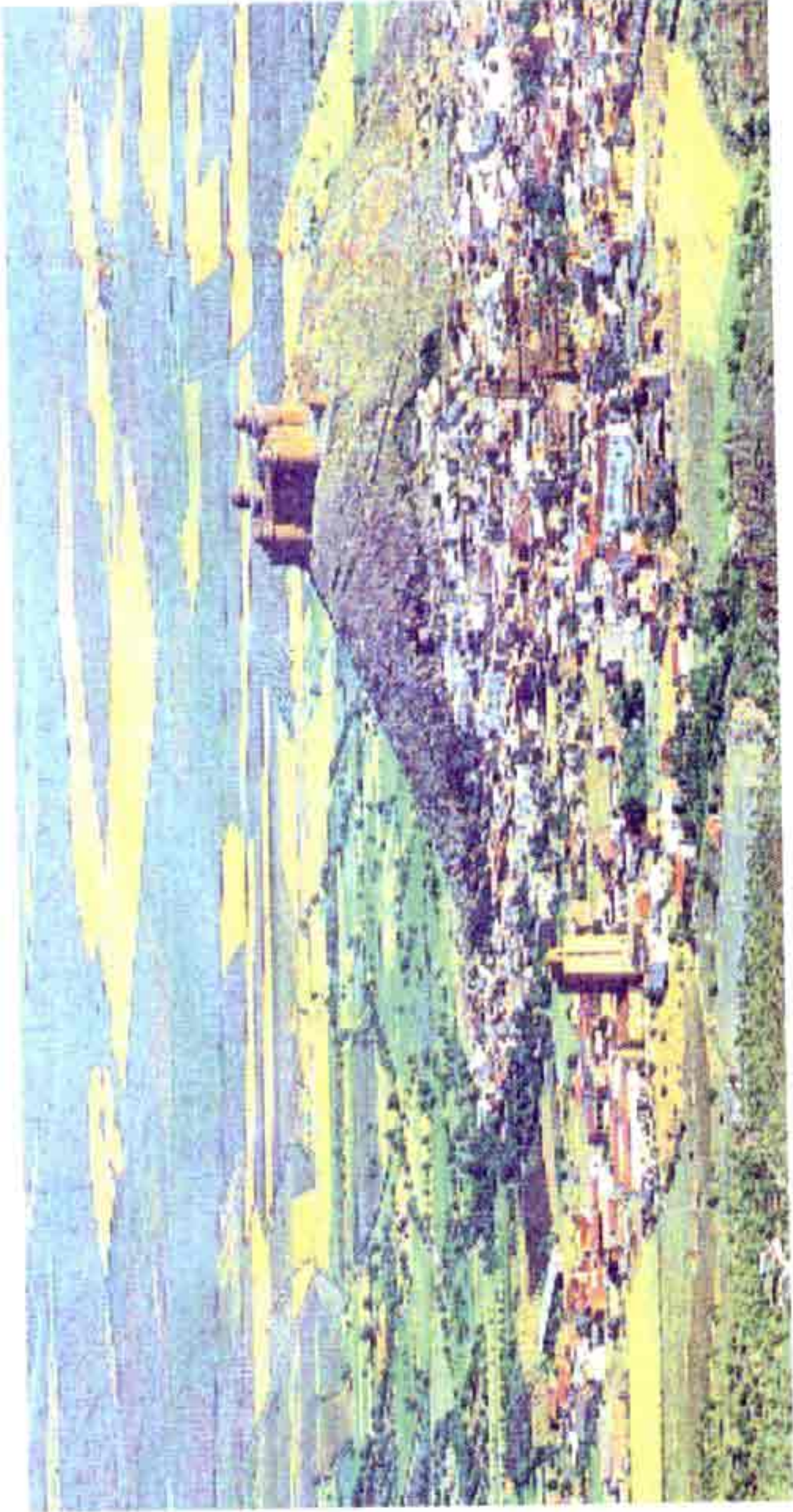
غرناطہ کے مضافات میں اسلامی دور کا ایک قلعہ جو مسلمانوں پر ان کی بداعمالیوں اور نااہل حکمرانوں کی نالائقیوں کے سبب آنے والے مصائب کا چشم دید گواہ ہے۔

مالقہ: اسپین کا خوبصورت اور پُر فضا ساحلی شہر جہاں کے مسلمانوں نے کئی مرتبہ حملہ آور عیسائیوں کا بے جگری سے مقابلہ کیا اور جب تک ان کے اپنے ہم مذہب اقتدار پرستوں نے دشمن کا ساتھ نہ دیا تب تک انہوں نے اس جگہ کو دشمن کے قبضے میں نہ جانے دیا۔ نیچے کی تصویر میں مسلم دور میں تعمیر شدہ مضبوط قلعہ نظر آرہا ہے۔

مالقہ کے تاریخی شہر کا خوبصورت نظارہ

اسپین کے طول وعرض میں کہیں چلے جائیں، سڑکوں کے کنارے اس طرح کی عمارتیں اور قلعے دکھائی دیتے ہیں۔ مینار والی یہ عمارتیں کسی زمانے میں مسجدیں تھیں جنہیں سقوطِ غرناطہ کے وقت کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بالجبر کلیسا میں تبدیل کر دیا گیا اور آج 500 سال ہو گئے کہ یہ تکبیر کی آواز سننے کو ترس گئی ہیں۔
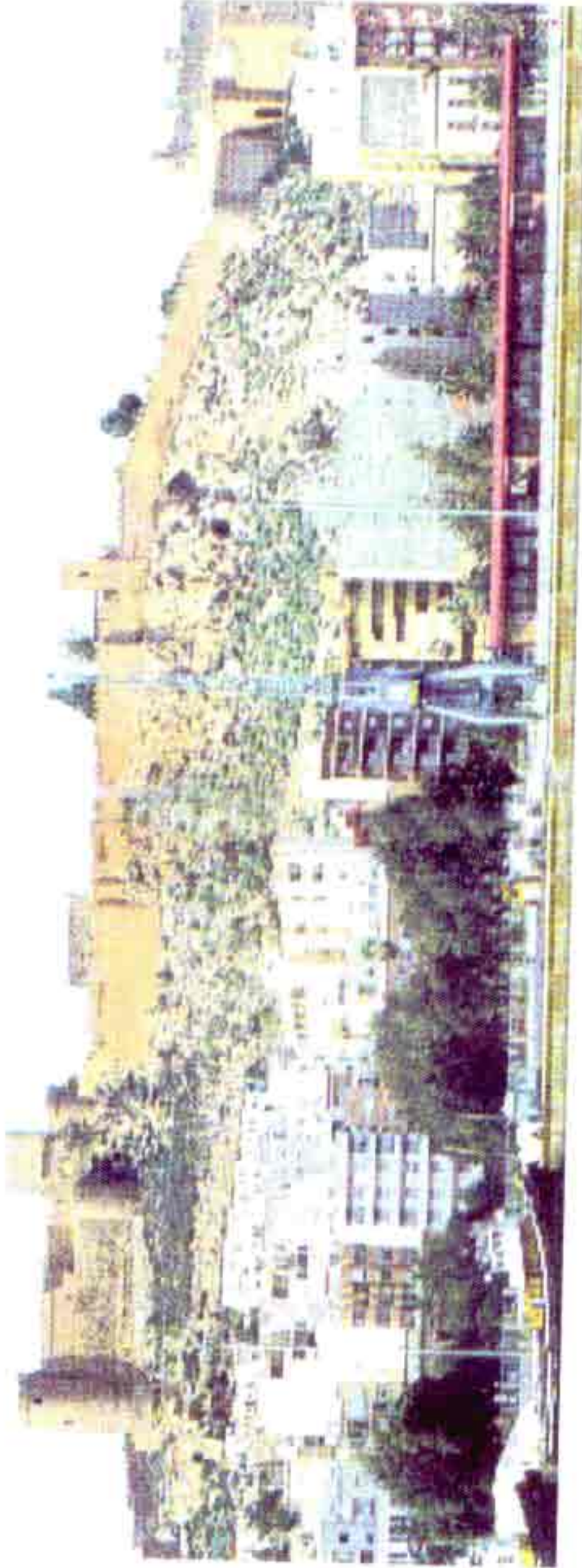
المیریہ کا مضبوط و مستحکم تاریخی قلعہ جو مسلمان حکمرانوں کی نااہلی اور خانہ جنگی کے سبب عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا اور غرناطہ کے سقوط کی آخری رکاوٹ بھی خود مسلم حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں ختم کردی۔